تیرہواں سفر ۔ رخِ رامپور نا گہاں

رامپور سے آنے کے بعد ہم نے اپنے آپ کو مختلف سماجی مدائن میں پیش پیش رکھا۔ پاکستان وومنز نیشنل گارڈ میں آگے رہے اور مختلف میلوں اور مینا بازاروں میں حصہ لیتے رہے۔ تقریباً ایک سال اسی طرح گزر گیا اور ۱۹۵۴ء کی عیدالفطر آ گئی جو جون کے پہلے ہفتے میں تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی انسان کے دل کو خبر پہلے لگتی ہے اور دنیاوی راستوں سے خبر بعد میں ملتی ہے۔ عید کے دن ہمارے بنگلے میں بھی حسبِ معمول پانی غائب تھا۔ خانساماں عید کی چھٹی لے کر گھر گیا ہوا تھا۔ ہم نے بچوں کو نہلائے بغیر نئے کپڑے پہنائے جو کہ جون کے مہینے میں ایک بدعت تھی۔ شام کو ہمارے شوہر باہر نکل گئے اور کافی دیر باہر رہے تو ہمیں تشویش ہوئی۔ اردلی کو باہر بھیجا کہ تلاش کرے۔ پتہ چلا کہ ذاکر صاحب قریب کے ایک قبرستان میں فاتحہ پڑھنے چلے گئے تھے۔ یہ ابھی واپس پہنچے ہی تھے کہ ڈاکئے نے آ کر ٹیلیگرام دیا جس کے مطابق ہمارے سسر ڈاکٹر امتیاز حسن نقوی کا ۲۹ رمضان، بمطابق ۴ جون ۱۹۵۴ء کو رامپور میں انتقال ہو گیا تھا۔ حالات کی کشیدگی کی بناء ذاکر صاحب کو فوج سے چھٹی بھی نہ ملی اور ہم اپنے دونوں لڑکوں اور اپنے شوہر کے بھانجے سبطِ محمد کے ساتھ رامپور روانہ ہوئے۔ اس وقت ہمارے ہاں ہمارے تیسرے بیٹے قمر کی ولادت ہونے والی تھی۔ پھر سفر ویسے بھی مشکل تھا کہ گرمی بہت تھی۔

پنڈی سے لاہور پہنچے۔ ہندوستان کے لئے اب پاسپورٹ کے علاوہ ویزے کی بھی ضرورت ہونے لگی تھی۔ ویزا ملنا آسان تھا۔ ہم لاہور میں ایک عزیز کے گھر تین دن رکے اور ہمیں ویزا ایک ہی دن میں

مل گیا اور ہم ۶ / جون کو لاہور اسٹیشن پہنچے۔ یہاں ہم اپنے بچوں اور اپنے شوہر کے بڑے بھانجے سبطِ محمد کے ساتھ ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے کہ ایک صاحب قریب آئے اور سبطِ محمد سے ہاتھ ملا کر بڑی گرم جوشی سے باتیں کرنے لگے۔ بے تکلفی سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں اور اس میں کشمیر اور ہمارے شوہر کا بار بار تذکرہ آتا رہا۔ ہم اپنے گھر کے سامنے سے روز آنہ فوج کے کانوائے گزرتے دیکھتے رہتے تھے، لیکن اس کے علاوہ ہمیں اِس کی خبر نہیں تھی کہ شوہر صاحب فوج میں کیا کرتے تھے۔ سبطِ محمد ملٹری کے اِنجینئرنگ کے شعبے میں تھے اور انہیں کچھ زیادہ معلومات تھیں۔ غرض یہ شخص بہت دیر تک اسی طرح کشمیر اور فوج کی باتیں کرتا رہا۔ جب ٹرین کے چلنے کا وقت ہوا اور ہم اپنے ڈبّے میں بیٹھنے لگے تو اس شخص نے آستین چڑھا کر گھڑی میں وقت دیکھا تو سبطِ کے منہ پر جیسے ایک سایہ سا گزر گیا۔ ٹرین چل پڑی تھی اور ہم اسٹیشن کے باہر آ چکے تھے جب سبطِ محمد نے ہمیں بتایا کہ اس شخص کی آستین پر ہندی میں اس کا نام گدا ہوا تھا جس سے عیاں تھا کہ یہ ایک ہندو شخص تھا جو ہم سے مستقل فوج اور آزاد کشمیر کے بارے میں باتیں کرتا رہا تھا۔ ذاکر صاحب راؤلہ کوٹ میں تھے اور سبطِ نے اُن کے بارے میں بھی اس شخص سے بات کی تھی۔ سارے راستے یہ قصہ ہمارے ذہن میں چکراتا رہا۔

رامپور پہنچے تو وہاں پہلے سے ہمارے شوہر کا پیغام پہنچا ہوا تھا کہ اس بارے میں ان سے بھی پوچھ گچھ ہوئی تھی۔ وہ شخص ہندوستانی جاسوس تھا اور ہم سے ملاقات کے بعد پاکستانی فوج نے اسے نظر بند کر لیا تھا۔ یہ شخص ہم سے معلومات لینا چاہ رہا تھا لیکن ہمارے پاس معلومات ہوتیں تو اسے ملتیں۔ بس اسی چکر میں وہ بیوقوف خود پاکستانی فوج کی نظر میں آ گیا اور دھر لیا گیا۔ رامپور میں ہمارا رہنا بہت مشکل ہو گیا۔ ہر روز ہندوستانی فوج کا ایک آدمی آتا اور طرح طرح کے سوالات کرتا۔ جب ہم اپنی سسرال آتے تو پوچھ گچھ یہاں بھی شروع ہو جاتی۔ بہرکیف ہم نے اپنے سسر کی رسومات پوری کیں۔ ہمارے سسر ڈاکٹر امتیاز حسین نقوی کی امروہہ کے قریب حسن آباد میں چند ہزار ایکڑ زمین تھی۔ اس کا انہوں نے اپنی زندگی میں بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ اُن کی بقیہ اولاد اور ہماری ساس کے پاکستان آنے کے بعد ہمارے سسر کی پہلی بیوی کی اولاد نے، جو کہ ہندوستان ہی میں رہی اور پاکستان نہیں آئی، یہ دعویٰ کیا کہ وہ حضرات ڈاکٹر صاحب کی کلّیم اولاد ہیں، اور اس طرح وہ تمام زمین ان کے نام ہو گئی۔ کچھ ہی سالوں بعد ہندوستان میں سوشلزم کا دور، دورہ ہوا اور حکومت نے ان سے ساری زمین لے لی اور بمشکل چند سو ایکڑ زمین ڈاکٹر صاحب کی اِن اولادوں کے نام رہنے دی تھی۔ اِس طرح یہ زمین آٹھ سو سال اِس خاندان کے پاس رہنے کے بعد ہاتھ سے ایسی ناکارگی سے نکل گئی۔

ہمارے ببّا ہمیں پہلے کی طرح تندرست وتوانا لگے۔ وہ ابھی بھی دن میں ۲۰ رمیل سائیکل چلاتے تھے۔ چہرے پر عجب سی مسکراہٹ ہوتی۔ صافہ باندھے، شیروانی پہنے ہوئے، سرخ وسفید رنگ، نیلی آنکھیں، قد ۶ رفٹ ۲ رانچ، اور چال بالکل سیدھی۔ روز آنہ ہمارے ہاں آتے یا ہم امّاں کے پاس چلے جاتے تو یہ ہمارے دونوں بیٹوں کو گھمانے پھرانے لے جاتے تھے۔ انہیں اپنے نواسوں پر بڑا فخر تھا، اس لئے بھی کہ ان کے اپنے سات بیٹے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے اور ہم صرف دو بہنیں بچی تھیں۔ ہماری بہن کے بھی تین لڑکے تھے، اور کوئی لڑکی نہ تھی، اور اب ہمارے بھی دو لڑکے تھے۔

ہمیں اس کی خبر نہ تھی کہ ہم اس مرتبہ کے بعد اپنے ببّا کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے ورنہ ہم پتہ نہیں کیا کرتے، مگر غیب کا علم تو خدا ہی کو ہوتا ہے۔ یہ نہ جانتے ہوئے ہم رامپور میں صرف دو ہفتہ رکے۔ واپسی پر ہم اپنی ساس، اپنی نند اور نند کے تیسرے بیٹے ابو محمد عرف صلّن کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے جیٹھ حبیب حسن کی پہلی بیگم اور اُن کے بچے اُنہی کے پاس ڈھاکہ چلے گئے۔ اِس طرح ہمارے سسر ڈاکٹر امتیاز حسن کا پورا گھرانہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کتنی کوشش کی تھی کہ سب رامپور ہی میں رہیں کیونکہ وہیں امروہہ اور دہلی کے درمیان اُن کے آباؤ اجداد نو صدیوں سے رہتے آرہے تھے۔

رامپور سے دہلی کی ٹرین کا سفر تو عام سا تھا، لیکن دہلی سے امرتسر کی ٹرین میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ٹرین چلنے کے کچھ دیر بعد ٹکٹ انسپکٹر لیس آئی اور سب کے ٹکٹ دیکھنے لگی۔ سب سے اس کی تسلّی ہوئی لیکن ہمارے دوسرے صاحبزادے شمس کی عمر پر اس نے زبردست اعتراض کیا۔ یہ ستمبر ۱۹۵۱ء کی پیدائش تھے اور ہم جون ۱۹۵۴ء میں سفر کر رہے تھے۔ بات یہ تھی کہ اگر یہ ۳ رسال سے زیادہ کے ہوتے تو ان کا آدھا ٹکٹ لگتا، اس سے کم عمر پر یہ بغیر ٹکٹ کے جاتے۔ ہم نے ان کا ٹکٹ نہیں لیا تھا۔ محترمہ کچھ پنجابی اور کچھ اردو میں مصر ہو گئیں کہ ''اس پتر دی عمر پاسپورٹ وچ بھی غلط ہے، اے پتر پنج سال دا ہے''۔ اس بات پر ہماری ساس کو غصہ آیا کہ یہ عورت شمس کی صحت پر نظر لگا رہی تھی۔ انہوں نے جھلاّ کر کہا کہ ''تیرے ہاں ہوتے ہوں گے چوہے کے بچے، ہمارے ہاں تو ایسے ہی ہوتے ہیں''۔ یہ سنتے ہی انسپکٹر لیس کا منہ ست گیا، تھوڑی دیر وہ شمس کو دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ گئی۔ سارے راستے ہم اپنے بچّوں کی نظر اتارتے رہے، اور اس سے ہم نے ایک سبق سیکھا، اور وہ یہ کہ اگر آپ سچائی پر ہیں تو اپنی بات منوانے کے لئے کبھی کبھی سخت روّیہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ سبق ہمیں

فوراً ہی کام آ گیا۔ وہ ایسے کہ جب ہم ہندوستانی سرحد پر پہنچے تو ہندوستانی سرحدی چوکی پر سارے پاسپورٹ جانچے گئے۔ سب کے صحیح نکلے، لیکن ہمارے بھانجے ابو محمد کی عمر پاسپورٹ پر غلط لکھی تھی۔ یہ تھے تو بارہ سال کے لیکن ان کی عمر ۲/ سال کی لکھی تھی۔ غالباً پاسپورٹ پر ہاتھ سے اندراجات کے دوران ۱۲/ کے عدد میں سے ایک کا ہندسہ رہ گیا تھا۔ باقی سارا خاندان ہندوستان کی اٹاری چوکی سے پاکستانی واہگہ چوکی طرف روانہ ہو چکا تھا، کیونکہ یہ کافی لمبا راستہ تھا اور پیدل چلنا ہوتا تھا۔ اب ہم، ہمارے بچے، اور ابو محمد اکیلے وہاں تھے۔ بڑی کشمکش کا عالم تھا۔ ہندوستانی حکام مصر تھے کہ ہم واپس رامپور جائیں اور پاسپورٹ پر عمر صحیح لکھوا کر لائیں۔ ہم ان پر کھل کر گرم ہو گئے کہ انہوں نے یہ بات اس وقت نہیں کہی جب خاندان کے باقی لوگ بھی اِدھر ہی تھے۔ بہت گرما گرمی اور بحث مباحثہ کے بعد بھی وہ نہ مانے۔ غلطی ہندوستانی پاسپورٹ آفس کی تھی۔ جلدی میں سب کے پاسپورٹ بنے تھے اس لئے ہم ان کو دیکھ بھی نہیں سکے تھے، ساتھ میں سسر کی رسومات، اور پھر ہندوستانی جاسوسی ادارے کی مستقل پوچھ گچھ۔

ہمارا قلی سکھ تھا، اس نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور ایک اوپری عہدیدار بنام راؤ صاحب کے پاس لے گیا۔ وہ اپنے چھپر کے نیچے سو رہے تھے کیونکہ اس وقت دفتر کا وقت بھی ختم ہو چکا تھا اور شام ہو چلی تھی۔ قلی نے ان کو تفصیل بتائی۔ راؤ صاحب نیند سے اُٹھنے پر خوش نہیں تھے اور قضیہ سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ انہوں نے پاسپورٹ دیکھا اور کہا کہ ''یہ سب ٹھیک ہے، آپ جائیں''۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر پاکستان کی سرحد کی طرف پیدل چلنا شروع کیا۔ تقریباً ۶/ بجے پاکستانی چوکی پر پہنچے تو ہمارے لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے قلی کی مزدوری ادا کی، انعام کے ساتھ، کہ اُس کے بغیر ہم بہت پریشانی میں ہوتے۔ اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ لاہور کی ساری سواریاں جا چکی تھیں۔ واحد ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اگلی ٹرین دوسرے دِن جاتی تھی، اور اگر ٹرین نہیں تو سواریاں کیوں ہوں؟ غرض اس ٹیکسی والے کو طے کیا کہ وہ ۳۰۰/ روپے میں ہم سب کو لاہور اسٹیشن پر چھوڑ کر آئے۔ وہ راضی تو ہو گیا، لیکن اس ٹیکسی میں گیارہ آدمی اور ان کا سامان کیسے گیا، یہ مت پوچھیں۔ مزید یہ کہ ہماری ساس اور نند ماشاء اللہ بہت صحتمند تھیں اور ہمارے ہاں بھی تیسرے بیٹے کی آمد آمد تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ وہ بھاگ بھاگ کے پنڈی کے ٹکٹ لایا اور ہمارا سامان ٹرین میں چڑھانے میں مدد کرتا رہا۔

ہم سب نے بمشکل ٹرین میں قدم رکھے ہی تھے کہ سیٹی بجی اور ٹرین چل پڑی۔ٹرین میں مجمع بہت اور بیٹھنے کی جگہ مفقود۔ ہمارا چھوٹا بچہ ہماری گود میں، اور دوسرے ہاتھ سے ہم نے بڑے لڑکے کا ہاتھ پکڑا ہوا۔ کھڑے اس طرح کے ایک پیر سامان کے ایک طرف اور دوسرا پیر سامان کے دوسری طرف۔ پیچھے سے نند ہمیں پکڑے ہوئے کیونکہ ہمارے ہاتھ گھرے ہوئے تھے بچوں میں اور ہم خود سہارا کوئی پکڑ نہیں سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں مل جل کر جگہ بنائی، بچوں کو بٹھایا، کچھ کھایا پیا، اور بچوں کو برتھ پر سلا کر آرام کی ٹھانی۔ اتنی دیر میں ہماری ساس، نند اور دوسرے سسرالی بھی گہری نیند میں جا چکے تھے۔ ہمارے والد کی نصیحت تھی کہ سفر میں سونا نہیں چاہیئے سو ہم نے پڑھنے کے لئے ایک رسالہ نکالا اور شروع کیا ہی تھا کہ ایک صاحبہ نے ہمیں مخاطب کیا، ''کہاں جا رہی ہو؟''۔ ہم نے بتایا، تو وہ اٹھ کے بیت الخلاء جاتے ہوئے ہم سے آہستہ سے بولیں ''ذرا دیکھیں یہ آپ کے برابر کی سیٹ پر یہ عورت چادر اوڑھے کب سے نماز پڑھ رہی ہے، اس کی نماز ختم ہی نہیں ہوتی۔ مجھے تو شک ہو چلا ہے۔ ان سے بولو کہ اب نماز پڑھ چکیں''۔اب ہمیں بھی تشویش ہوئی کہ لاہور چھوڑے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چلا تھا اور یہ وہاں سے نماز میں مصروف تھیں۔ ہم نے ان سے کہا ''بہن آپ اتنی لمبی نماز کون سی پڑھ رہی ہیں، اور یہ زنانہ ڈبّے میں ایسا گھونگھٹ کیوں نکالا ہوا ہے؟''۔اس خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا اور نماز چلتی رہی۔ اتنے میں وہ دوسری خاتون بیت الخلاء سے باہر آئیں اور نمازی بیگم کو دیکھتے ہوئے کہنے لگیں، ''بس بہت ہو گیا۔ میں تو اب زنجیر کھینچے چلی''۔ یہ سن کر نمازی بیگم اور زور زور سے ہل کر نماز پڑھنے لگیں۔ ادھر دوسری بیگم نے زنجیر کھینچی اور ٹرین رکنے لگی۔ نمازی بیگم ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں، یا یہ کہیئے کہ نمازی شاہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اِدھر گاڑی رُکی اور نمازی شاہ دھم سے گاڑی کے باہر کودے اور یہ جا وہ جا۔ہم حیران و پریشان، سہم گئے۔ یہ باہمّت صاحبہ بولیں، ''اللہ نے کرم کر دیا۔آپ کے سارے لوگ بہت زیور پہنے ہوئے ہیں اور اس طرح کی چوریاں اور ڈکیتیاں بہت ہوتی ہیں اس راستہ پر''۔ اندازہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے آنے والی مہاجر خواتین اپنا زیور پہن کر آتی تھیں تاکہ ہندوستان کے کسٹمز افسران سے بچت رہے۔ ہماری ساتھیوں نے بھی یہی کیا تھا، لیکن اس کا اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستانیوں سے جو بچت ہوتی اس کا حساب کتاب برابر کرنے کے لئے اپنے پاکستانی مسلمان لاہور سے ملتان اور لاہور سے راولپنڈی کی ریل گاڑیوں میں موجود تھے۔ ہم نے اپنی ساس، نند اور بھتیجیوں کے زیورات اتار کر پرس میں رکھے اور یہ لوگ اتنا تھک کے سوئے ہوئے تھے کہ انہیں خبر تک نہیں ہوئی۔ جب یہ سب جاگے تو سن کے کچھ پریشان اور کچھ شرمندہ

سے ہوئے ،لیکن شکر کیا کہ کسی بڑے واقعے سے بچ گئے ۔اس زمانے کا ہر سفر ایک معرکہ تھا۔ٹکٹ خریدنے سے لے کر اپنی نشست پر قابو پانا، پھر پینے اور کھانے کی چیزوں کو نوش فرمانے کے بعد بھی صحتمند رہنا، چوروں اور کسٹمز افسران سے اپنی چیزوں کو محفوظ رکھنا، یا گرمی، سردی، اور بارشوں میں میلوں پیدل چلنا یا تانگہ پر جانا، غرض ہر لمحہ ایک جنگ ہوتی تھی۔

کچھ دن ہمارے یہاں رہ کر ہماری ساس اور نند اور دوسرے لوگ سبطِ محمد کے ساتھ بنّوں چلے گئے۔ ہم یہیں اپنے گھر میں پھر روزمرّہ کے کام کاج میں مشغول ہو گئے۔ عام زندگی تھی، وہی پاکستان وومینز نیشنل گارڈ اور وہی مینا بازار اور فوج کی پارٹیاں، کہ یکم اپریل ۱۹۵۵ء کو ہمارے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ سارا دن عام روَشی میں نکل رہا تھا۔ اپریل فول کا ہنسی مذاق ہو رہا تھا، لیکن ہمیں اندرونی طور پر اس میں شمولیت کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ شام کو ہمیں ٹیلیگرام ملا کہ ہمیں یاد کرتے ہوئے ببّا اپنی آخری منزل پر روانہ ہو گئے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد یکے بعد دیگرے یہ دوسرا سانحہ تھا۔ ہم نے قران خوانی اور گریہ میں کئی دن گزار دیئے، لیکن ہندوستان نہ جا سکے کہ اپنی امّاں اور باجی سے مل لیتے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ایک تازہ جھڑپ ہو چکی تھی اس لئے ہمیں ویزا نہ مل سکا تھا۔

چودھواں سفر ۔ کراچی کو ہجرت

اسی طرح وقت گزرتا رہا، گرمیاں ختم ہوئیں ۔ اب سردی شروع ہوگئی تھی اور ہمارے شوہر ذاکر صاحب ابھی بھی راوَلہ کوٹ میں تعینات تھے ۔ یہ جب بھی وہاں جائیں، بچے اداس ہو جاتے ۔ پھر سردیوں میں برف پڑتی تو راستے بند ہو جاتے تھے اور واپسی مزید مشکل ہو جاتی ۔ اب اس مرتبہ جب انہوں نے جانے کی تیاری شروع کی تو ہم سب نے بڑا رکنے کے لئے کہا، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا تو امکان نہیں تھا ۔ لیکن اس مرتبہ اُنہوں نے ہنس کے کہا کہ ''اچھا اگر بیگم فون کرادیں کہ کوئی بھی بات ہوگئی ہے، تو ہم دیکھیں گے'' ۔ ہم نے بھی مذاقاً کہہ دیا کہ ''ٹھیک ہے ہم اپنی بیماری کا پیغام بھجوادیں گے'' ۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے ایک سوئٹر بننا شروع کردیا جو ذاکر صاحب نے اپنے کسی دوست کے لئے ہم سے کہا تھا ۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے کہ سوئٹر اور جرسیاں گھر میں بُن کردی جاتی تھیں، کوئی بنی بنائی بازار سے خریدنا ابھی فیشن میں نہیں تھا ۔ سوئٹر ختم کر کے ہم بٹن لگا رہے تھے کہ ایک دم سردی لگنے لگی ۔ اب جوں توں کر کے سوئٹر کو بھیجنے کے لئے تیار کیا کیونکہ صبح کو یونٹ کا ایک آدمی راوَلہ کوٹ جا رہا تھا اور اس کے ساتھ سوئٹر بھیجنے کا خیال تھا ۔ اردلی کے ہاتھ سوئٹر روانہ کیا، اور لیٹے تو سردی رکنے کا نام نہ لے ۔ ایک کمبل کے بعد دوسرا، پھر لحاف، اور مزید کمبل ۔ اور ہم پھر بھی تھر تھر کانپتے رہے ۔ گھر کے سامنے ملٹری کا CMH تھا، لیکن وہاں جانے والا کوئی نہ تھا ۔

صبح ہوتے ہی بڑے لڑکے نجم کو بھیج کر ہسپتال سے ڈاکٹر کرنل سرور کو گھر بلوایا ۔ انہوں نے آتے ہی ہمیں فوراً فوج کے فیملی ہسپتال میں بھیج دیا جہاں ہم داخل ہوگئے ۔ معلوم ہوا کہ ہمارے دونوں پھیپھڑوں پر نمونیہ

کا اثر ہوا تھا۔ اب ہم فون پر فون کرواتے رہے ذاکر صاحب کو کہ آپ کی بیگم سخت بیمار ہیں، لیکن ہمارے شوہر اس کو مذاق سمجھتے رہے۔ برف کی وجہ سے راستے بند ہو چکے تھے اور فوج صرف خاص ضرورت پر سپاہیوں اور افسروں کو آنے جانے کی سہولت دے رہی تھی۔ اِدھر ہماری حالت بہت نازک ہوگئی اور اسی میں ایک ماہ گزر گیا۔ پھر ایک جاننے والے صاحب بذاتِ خود ذاکر صاحب سے ملے اور انہوں نے ذاکر صاحب کو پوری تفصیل بتائی تو ذاکر صاحب اسی دن ہسپتال میں موجود تھے۔ ہم نے بھی توبہ کی کہ مذاق میں بھی ایسی بات آئندہ منہ سے نہ نکالیں گے۔ سو سبق یہ ہے ہر وقت زبان سے اچھی بات نکالئے۔

ہمارے ہسپتال کے رہنے کے دوران ہماری ساس اور نند اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ راولپنڈی آ گئیں تھیں۔ ذاکر صاحب واپس راؤلہ کوٹ چلے گئے۔ ہسپتال میں ایک نرس مس حسین نے ہماری بہت دیکھ بھال کی۔ یہ نرس ہمیں اسپنج سے غسل دیتی تھیں، پہیوں والی کرسی پر باہر سیر کراتیں اور بہت دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ہم ہسپتال میں تین ماہ رہے۔ اکیلے میں سارا وقت اماں اور ببّا یاد آتے رہے، ویسے بھی کہتے ہیں کہ مشکلوں میں والدین زیادہ یاد آتے ہیں۔

کچھ وقت اور گزر گیا اور پھر گرمیاں آ گئیں۔ ۱۹۵۶ء میں ہمارے شوہر نے آرمی چھوڑ دی اور ہم سب نے کراچی آنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے پنڈی میں فوج کا بنگلہ چھوڑا اور عارضی رہائش کے لئے ایک چھوٹا سا گھر لے لیا۔ ذاکر صاحب کراچی آ گئے اور انھوں نے یہاں امریکن امبیسی کی سیکیورٹی میں ملازمت حاصل کر لی اور مسلم لیگ کالونی میں ایک گھر لیا۔ یہ گھر بھی تین کمروں کا تھا، اور اس کے بڑے سے دالان میں ایک فوّارہ بھی تھا۔ اب اُس زمانے میں کراچی میں اتنا پانی تھا کہ گھروں میں فوّارے چلتے تھے اور اس فوّارے کے حوض میں پانی بھرا جاتا تھا۔

یہ گھر لے کر ذاکر صاحب نے ہمیں خط لکھا کہ آپ چلی آئیں۔ ہم نے ساری رات تیاری کی، کھانے تیار کئے اور ناشتہ دان میں رکھا۔ ہم پانچ افراد تھے..... ہم مابدولت، ہمارے تین لڑکے، اور ہماری منہ بولی بیٹی جو ہمارے جیٹھ کی لڑکی تھی۔ گرمی کا موسم ہٹ کر بارشوں کا موسم شروع تھا۔ دو دن گرمی تو تیسرے دن گرج چمک کے ساتھ بارش ہوتی تھی۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ صبح ۷/ بجے ریل گاڑی کا وقت تھا اور رات کو موسلا دھار بارش شروع ہوئی تو صبح بھی بارش ہو رہی تھی۔ تانگہ لانے کے لئے اپنے بھانجے کو روانہ کیا اور

تھوڑی ہی دیر میں تانگہ آ گیا۔ یہ کھلا تانگہ، اور ہر طرف سے بارش۔ ہمیں کچھ رامپور یاد آیا کہ جہاں تانگے کم از کم چاروں طرف پردے کے ساتھ مل سکتے تھے، جو گرمیوں میں کچھ ٹھنڈے اور بارش سے بچاؤ کے لئے بہت اچھے تھے۔ غرض ہم نے اسی تانگے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ وقت بہت کم تھا اور ریل گاڑی چلنے والی تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ سامان تولا جاتا۔ بس اترے اور سامان ٹرین میں رکھوا کے ہم پانچوں ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب دوپہر ہوئی اور ہم نے کھانے کے لئے ناشتہ دان کھولا تو دیکھا کہ اس میں سے کھانا غائب۔ خیال ہوا کہ گھر پر بھانجوں نے کھا لیا ہوگا۔ ایک اسٹیشن پر جب ریل گاڑی رکی تو ڈائننگ کار کے ایک ویٹر کو بلا کر کھانا منگوایا۔ اسی طرح سارے راستے دو کھانے اور دو ناشتے وہاں سے ہوئے اور ہم اپنا پرس کھول کھول کر پیسوں کا حساب کرتے رہے کیونکہ کسی مرد ہمسفر کے بغیر زیادہ نقدی ساتھ لے کر چلنا خطرناک تھا اور ابھی کریڈٹ کارڈ تو ایجاد ہوئے نہیں تھے۔

کراچی پہنچے تو اسٹیشن پر ہمارے شوہر نہیں نظر آئے، حالانکہ ہم نے اپنے بڑے بھانجے سے خاص طور پر انہیں پیغام بھجوایا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر خود ہی قلیوں کو بلوایا کہ سامان اتارا جائے۔ سامان اترا اور ٹکٹ جانچے گئے۔ ریلوے کے انسپکٹر کے اندازے کے مطابق یہ سامان کچھ زیادہ تھا۔ سامان تولا گیا اور انسپکٹر نے اعلان کیا کہ سامان واقعی زیادہ تھا۔ اب جو انہوں نے حساب بتایا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ کھانے پر خرچ کرنے کے بعد ریلوے کو بخشش کے لئے تو پیسے نہیں بچے تھے۔ ہم نے ان انسپکٹر سے کہا کہ سامان یہیں رکھیں ہم باہر سے جا کر فون کرتے ہیں۔ وہاں سامان کے ساتھ بڑی لڑکی تسنیم اور دوسرے بیٹے شمس کو چھوڑا، اور اپنے ساتھ بیٹے نجم اور قمر کو لے کر اسٹیشن سے باہر آئے۔ ایک فون بوتھ نظر آیا لیکن وہ صرف پیسے کی ایسی گولک ثابت ہوا کہ جس میں آپ صرف پیسے ڈال سکتے ہوں، نکال نہیں سکیں۔ اس نے کافی پیسے کھانے کے بعد بھی کام نہیں کیا۔ ہم واپس اندر آئے اور ریلوے انسپکٹر کو صورتِ حال سمجھائی۔ انہیں بتایا کہ ہم اب اپنے شوہر کے دفتر جا کر دیکھتے ہیں کہ کیا صورتِ حال ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے انہوں نے ہم سے کہا، ''آپ جائیں ہم یہاں ہیں، بچّوں کی پرواہ نہ کریں''۔ کیسے پرواہ نہ کریں بچّوں کی، ہم نے دل میں کہا۔ بہرحال تین بچوں کو وہاں چھوڑا اور انہیں سمجھا دیا کہ یہاں ہی رہنا، کہیں جانا نہیں۔ باہر آئے۔

کراچی سٹی اسٹیشن اور محمّدی ہاؤس تقریباً آمنے سامنے ہیں، لیکن یہ ہمیں پتہ نہیں تھا۔ ہم نے باہر

ایک رکشہ والے سے پوچھا کہ وہ محمدی ہاؤس کے کتنے پیسے لے گا۔ جواب ملا کہ چالیس روپے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب بکری کا گوشت ۱۲/آنے سیر تھا اور گائے کا گوشت ۵/آنے سیر۔ ایک روپیہ میں ۱۶/آنے ہوتے تھے۔ اب ہمیں اور پریشانی کہ یہ محمدی ہاؤس نہ جانے کہاں ہے کہ اتنے پیسے لگیں گے۔ ایک گھوڑے گاڑی والے سے پوچھا، تو اس نے بھی ایسی ہی دہلانے والی رقم کا اعلان کیا، اور پھر ایک دوسرے رکشا والے نے بھی۔ اب ہم سخت پریشان کہ درحقیقت ۴۰/روپے ہوتے تو سامان کے نہ ادا کر دیتے، اور پھر کوئی پتہ بھی نہیں کہ ذاکر صاحب اپنے دفتر میں ہوں بھی یا نہیں۔ اتنے میں ایک صاحب قریب آئے اور کہنے لگے، ''یہ سب لوگ لوٹ مار کر رہے ہیں اور تمام سیاحوں اور نو واردلوگوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ محمدی ہاؤس وہ سب سے اونچی عمارت ہے جو سامنے نظر آرہی ہے۔ آپ چاہیں تو میرے رکشا میں چلیں ورنہ میں آپ کو پیدل ہی وہاں تک چھوڑ آتا ہوں''۔ اس زمانے میں یہ ۱۰/منزلہ عمارت کراچی کی بلندترین عمارت تھی اور دور دور سے نظر آتی تھی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا، اور اس کے ساتھ محمدی ہاؤس پہنچ گئے۔ ہمارے شوہر یہاں محمدی اسٹیم شپ کمپنی میں کام کرتے تھے جو کہ اس وقت پاکستان کی سب سے بڑی سمندری جہازوں کی کمپنی تھی اور اس کے جہاز سامان کے علاوہ حاجیوں کو سعودی عرب لانے لے جانے کا کام کرتی تھی۔

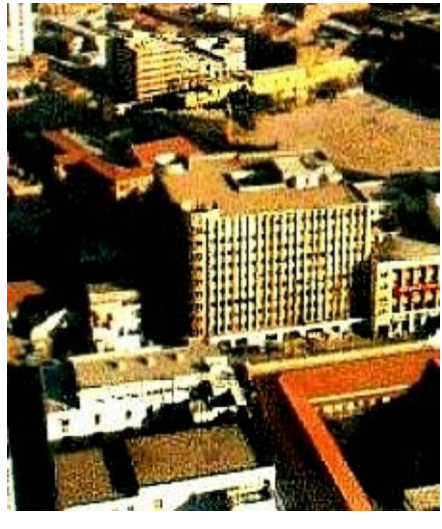

کراچی ۔ محمدی ہاؤس

ذاکر صاحب کا دفتر تیسری منزل پر تھا۔ عمارت میں لفٹ تھی، لیکن ہم نے سیڑھیاں چڑھنا مناسب

سمجھا کہ اس سے ہم اس وقت تیزی سے جا سکتے تھے۔ ذاکر صاحب کے دفتر کے دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ ہم نے دروازے پر دستک دی۔ اب ہم جب اپنے شوہر سے ملے تو وہ ششدر رہ گئے اور کہنے لگے کہ آنے کی خبر کیوں نہ دی اور بچے کہاں ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے انہیں سب کچھ بتایا اور ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارے بھانجوں نے غالباً پیغام بھیجا نہ تھا ہمارے کراچی آنے کے بارے میں۔ ذاکر صاحب کچھ دیر کے لئے اندر اپنے دفتر میں گئے اور اندر کچھ لوگوں کو ہدایات دے کر ہمارے ساتھ اسٹیشن کی طرف چلے۔ اسٹیشن پر پہنچے تو وہ انسپکٹر ابھی بھی بہت ذمّہ داری کے ساتھ سامان اور بچّوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب کو دیکھتے ہی بولے، ''ارے نقوی صاحب، آپ کہاں؟ یہ لوگ کون ہیں؟'' ذاکر صاحب نے ہم سب کا تعارف کروایا۔ اب انسپکٹر صاحب بڑی ندامت سے کہنے لگے، ''بھابی، افسوس ہے اور شرمندہ ہوں کہ آپ کو زحمت اٹھانا پڑی۔ آپ بتا دیتیں''۔ ان کا تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک صدیقی صاحب تھے اور کراچی سٹی اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ قریب ہی قلی بھی سامان کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ اب سوچیں کہ اس زمانے میں اتنی مروّت اور اتنا لحاظ تھا کہ آپ اکثر دوسروں پر اعتماد کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے باہر نکل کر اس شخص کو تلاش کیا جو ہمیں محمدی ہاؤس چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ نہ ملا کہ ہم اس کا شکریہ ادا کر سکتے۔ ہم پہلے جلدی میں بھول گئے تھے۔

اسٹیشن سے ناظم آباد بہت دور لگا۔ سب علاقہ نیا ہی تھا اور ناظم آباد میں ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ پہلی چورنگی اس وقت رضویہ چورنگی کہلاتی تھی اور بعد میں صرف چورنگی کا نام رہ گیا۔ دوسری چورنگی کا نام پٹرول پمپ چورنگی پڑ گیا تھا، جو بعد میں صرف پٹرول پمپ کے نام سے یاد کی جانے لگی۔ دوسری چورنگی کے آگے پاپوش نگر آباد ہو رہا تھا، اور پاپوش نگر کے آگے کے حصے کو لوگ نارتھ ناظم آباد کہتے تھے اور یہاں حکومت نیا دارالحکومت بنانے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ لیکن اس وقت تک یہ جنگل بیابان تھا جہاں کیکٹس کے درختوں کی بہتات تھی۔ ہمارا مکان مسلم لیگ کالونی میں تھا جہاں کسی کمپنی نے دو اور تین کمروں کے مکان بنائے تھے۔ ہمارا مکان ایک کونے کا تھا اور اس میں تین کمرے تھے، اور اس کا نمبر تھا ۸/ ۳۸۔ یہاں سارے ہی لوگ نئے تھے، اور مہاجر تھے، اس لئے آباد ہونے اور گھلنے ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

کراچی کا پرانا علاقہ بہت خوبصورت تھا۔ نہایت صاف ستھرا اور بہت قائدے اور حساب سے بنا ہوا۔ اسی طرح مسلم لیگ کالونی اور ناظم آباد بھی تھے۔ وقتاً فوقتاً مچھر مارنے کے لئے جھاڑیوں میں ڈی ڈی ٹی

کا چھڑکاؤ ہوتا۔ اس وقت کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس سے کینسر ہوسکتا تھا۔ ہمارے گھر کے باہر بہت اچھے پیڑ لگے تھے اور اس پر ان چھڑکاؤ کرنے والوں کا خاص رحم تھا، اور پھر وہ ہمیں بھی خوش کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ دوا چھڑک کر جاتے تھے۔ سڑکوں کی بھی صفائی وقت سے ہوتی رہتی تھی۔

آتے ہی بچوں کے اسکول کی تلاش ہوئی۔ سولجر بازار کا فرویلز کیمبرج اینڈ ہائی اسکول مشہور تھا اور اچھا سمجھا جاتا تھا۔ تینوں بڑے بچوں کو وہیں داخل کرادیا۔ شمس تو کے جی ون میں تھے اور ان کو روز آنہ روتے دھوتے اسکول پہنچانا ہوتا تھا۔ وہاں جانے کے لئے ڈبل ڈیکر بس سے ہمارے شوہر اور یہ بچے صبح کو پہلی چورنگی جاتے، اور ایک باسلیقہ قطار میں کھڑے ہوکر بس کا انتظار کرتے۔ بس آتی تو سب سلیقہ سے سوار ہوتے۔ ایک آنہ ٹکٹ تھا۔ یہ بچے سولجر بازار پر اتر جاتے، اور واپس اکیلے ہی آتے تھے۔ دوپہر کا کھانا ذاکر صاحب ہمیشہ گھر سے منگواتے تھے۔ اس کام کے لئے ایک شخص گھر پر آتا تھا۔ ہم ۱۰ر بجے سے پہلے کھانا پکا کر ایک ناشتہ دان میں رکھ لیتے تھے۔ یہ ناشتہ دان ٹفن کہلاتا تھا۔ ساڑھے دس بجے تک یہ ٹفن کیریئر والے صاحب آتے اور نہ جانے کس صورت سے دو گھنٹے کے اندر اندر کھانا اس وقت کی میکلوڈ روڈ پر محمدی ہاؤس میں پہنچادیتے۔

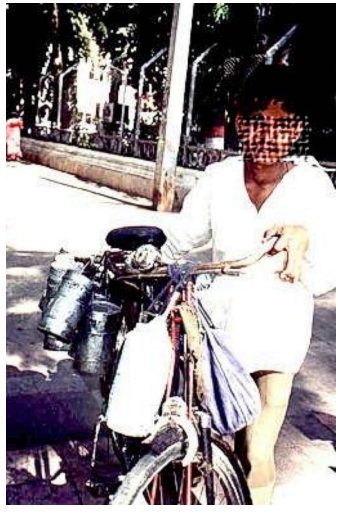

ٹفن کیریئر: سائیکل پر ناشتہ دان کا پورے شہر کا سفر

شہر میں سڑکوں پر محمدی ٹراموے کی ٹرامیں بھی چلتی تھیں جو صدر سے کینٹ ریلوے اسٹیشن، صدر سے کیماڑی، اور صدر سے سولجر بازار تک چلتی تھی جہاں ان بچّوں کا اسکول تھا۔ ڈیزل سے چلنے والی یہ ٹرام

کاریں بہت دھواں دار تھیں اور ان سے حادثات بہت ہوتے تھے۔ جب ۱۹۷۰ء میں یہ بند ہوئیں تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کراچی میں سڑکوں پر بدتہذیبی اور بداخلاقی بعد میں شروع ہوئی ورنہ ۱۹۶۵ء تک یہاں بہت نفاست رہی۔ ہم نے ہندوستان کے بہت اعلیٰ خاندانوں کے لوگ کراچی کی کچّی بستیوں کی جُھگیوں میں دیکھے۔ یہ لوگ ایک کار میں جو چند چیزیں آسکیں، ڈال کر پاکستان چلے آئے تھے۔ اب جھگّی کے باہر کار کھڑی تھی اور اندر بس وہ چند چیزیں تھیں۔ گولیمار کی جھونپڑیوں میں ایسے لوگ ملے جن کی ہندوستان میں پورے گولیمار کے رقبے سے زیادہ زمینیں تھیں، لیکن کچھ قسمت اور کچھ آگے کی سوچ میں کمی کی وجہ سے لوگ پاکستان کے بننے کے سلسلے میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے تھے اور اب یہاں کے کچھ نادان لوگوں کے مذاق کا نشانہ بن رہے تھے۔ یہ سب کچھ ہمیں راولپنڈی میں نظر نہیں آیا تھا کیونکہ وہاں مہاجر کم تھے اور فوج کی زندگی نے ایک پردہ سا ڈالا ہوا تھا باقی کے پاکستان پر۔ اب پچاس سال بعد بھی فوج کی زندگی عام شہری زندگی سے مختلف ہے۔

ان نئی جگہوں پر بجلی کا انتظام ابھی ہو رہا تھا، اور بہت کم گھروں میں بجلی تھی۔ سعودی عرب نے کافی مدد کی تھی اور کئی کالونیاں ان کی امداد سے بھی بن رہی تھیں۔ ہمارے گھر میں بجلی ابھی نہیں آئی تھی، لیکن پانی بڑی روانی سے آتا تھا۔ اتنا پانی ہمیں بعد میں کسی گھر میں نہیں ملا، اور ۱۹۶۵ء کے بعد تو ہر جگہ پانی مفقود ہو گیا تھا۔ اس کراچی میں بڑی گنجائش تھی۔ ہر جگہ کے لوگ آکر بسے۔ کچھ لوگ بدلے، لیکن خاندانی روایات بدلنا آسان نہیں تھا۔ ہم نے سفید پوشی قائم رکھی اور یہاں کی تیز رفتار زندگی کے ساتھ قدم جما کے چلتے رہے۔

ناظم آباد کے رہائشی علاقوں کی پلاننگ اچھی تھی۔ ہمارے گھر کے بالکل ہی برابر کھیل کے چار میدان تھے جو یہاں کے آبادی کے حساب سے مناسب تھے۔ ہر اتوار کو کرکٹ کے مقابلے ہوتے اور ان میدانوں میں کم از کم چھ مقابلے ایک ساتھ ہو جاتے تھے۔ ہر شام بچے ویسے بھی کھیلتے تھے۔ خود ہمارے گھر کے باہر ''فرنٹ یارڈ'' میں اتنی جگہ تھی کہ ذاکر صاحب دو بڑے بچوں کو کرکٹ کی باؤلنگ اور بیٹنگ کی تربیت دیتے تھے، ساتھ میں پڑوس کے دو ایک بچے بھی شامل ہو جاتے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں کھیل کے یہ میدان مختلف اپارٹمنٹ کمپنیوں کو بک گئے اور اب یہاں کوئی میدان دیکھنے کو نہیں ملتے۔ بچے سڑکوں پر کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ملنے ملانے کے لئے ہم نے اپنے جاننے والے دوسرے لوگوں کی تلاش کی۔ حبیب بینک کے انتخاب حیدر عابدی کی بیوی رامپور کے مرتضیٰ علی خاں کی بیٹی نکلیں، اور اُن سے ہماری اچھی ملاقات رہی۔ ڈاکٹر واحدی

نیول ہسپتال میں ملے، ڈاکٹر قریشی جو لاہور کے تھے، یہاں ناک، کان اور گلے کے ماہر کی حیثیت سے تھے۔ پھر رامپور کے ذاکر علی خاں بھی ملے جو کراچی واٹر اور سیوریج بورڈ کے چیف انجینئر رہے اور بعد ازاں اسی ادارے کے مینیجنگ ڈائرکٹر بھی رہے۔ کئی رشتہ دار مل گئے، اور دور دور کے رشتے بھی ملنے جلنے کے بعد قریبی رشتہ دار ہو گئے۔ اس طرح کراچی میں ہمارے اگلے ۳۴ رسال کی زندگی کا آغاز ہوا۔

پندرہواں سفر ۔ کراچی سے رامپور

کراچی آئے ہوئے اب ہمیں دو سال ہو گئے تھے۔ اس وقفہ میں ہم نے کراچی دیکھا، اسٹیٹ بنک کی نئی عمارت بنتے ہوئے دیکھی۔ کلفٹن اور منوڑہ گئے، لیکن ہاکس بے اور پیراڈائز پوائنٹ ابھی نہیں گئے کیونکہ وہاں بس نہیں جا سکتی تھی۔ یہاں ہم بہت بعد میں گئے جب ہم نے بھی کار خرید لی تھی۔ گاہے بگاہے گاندھی گارڈن اور ملیر کے باغات چلے جاتے۔ بڑا شہر تھا اور دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔

کراچی: اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی نئی عمارت۔ برابر میں پرانی عمارت اور سامنے اُس وقت کی ڈبل ڈیکر بس۔

ہر ہفتہ کی شام کو ہم بچّوں کو لے ذاکر صاحب کے دفتر جاتے اور پھر سب مل کر کسی ریستوراں میں

جا کر کھانا کھاتے۔ بچّوں نے یہاں پہلی مرتبہ کوکا کولا پی اور بہت پسند کی۔ نہ جانے یہ کیسی چیز ہے کہ آج ۴۵ر سال کے بعد ان بچوں کے بچوں سے بھی کوکا کولا نہیں چھینی جاسکتی۔ یہیں پر ان صاحبزادوں نے آئس کافی پینے کی کوشش کی، لیکن پہلے گھونٹ کی حد تک۔ باہر کا کھانا مہینہ میں ایک بار ہی کھاتے تھے ورنہ صرف قلفی، کوکا کولا اور چکن کلب سینڈوچ کھا کر اور گھوم پھر کر گھر آجاتے۔

ہمارے ہاں ایک نئی اولاد کی آمد آمد ہوئی۔ ناظم آباد میں انکوائری آفس کے بس اسٹاپ پر ایک چھوٹا سا کلینک نما ہسپتال تھا۔ اس میں مریضوں کے لئے دو بڑے کمرے، ایک ڈاکٹروں کے لئے کمرہ، ایک دواخانہ اور سب کے لئے صرف ایک غسلخانہ تھا، اور اس کے علاوہ ایک بڑا سا میدان تھا۔ یہاں اب ناظم آباد ہسپتال ہے۔ بجلی ابھی نہیں آئی تھی اور رات کو مٹی کے تیل کی لالٹینیں جلتی تھیں۔ ہر مریض کو اپنی لالٹین خود لانا ہوتی تھی، اور بستر اور کھانا بھی گھر سے ہی لانا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہسپتال میں صبح کو ناشتہ کی چیزیں بیچنے والے آتے تھے اور مریض ان سے خریداری کر سکتے تھے۔ ہاں یہ تھا کہ وہاں پیدا ہونے والے بچّوں کو یونیسکو کی جانب سے دودھ کا پاؤڈر ملتا تھا۔ ہم تو اپنے بچّوں کو آسٹرملک پلاتے تھے، لیکن ہمیں ایک دو دفعہ یہ پاؤڈر ملا تو بڑے بچّوں نے اسے روکھا کھا لیا کہ اس کا ذائقہ انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ ہمارا گھر اس ہسپتال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بس مکانوں کی ایک قطار، اور پھر ایک کھیل کا میدان پار کریں تو ناظم آباد کی بڑی سڑک آجاتی تھی جو اس وقت دو رویہ نہیں تھی، اور نہ ہی اس کا کوئی نام تھا۔ اس مرتبہ ہماری پہلی لڑکی پیدا ہوئیں اور ہم نے ان کا نام تنظیم رعنا رکھا۔ گھر میں ہر ایک خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ تینوں لڑکے اور ذاکر صاحب ہر وقت اسے لئے لئے پھرتے تھے۔ ہماری منہ بولی صاحبزادی سب سے زیادہ خوش تھیں کہ اب انہیں اپنی ایک ساتھی مل گئی تھی اور یہ کہ اب انہیں تین بھائیوں کو اکیلے نہیں جھیلنا ہوگا۔

اسی دوران ہمارے شوہر نے محمّدی اسٹیم شپ چھوڑ کر ذیکرایا کارپوریشن میں کام شروع کر دیا۔ اس کمپنی کے مالک ایک صاحب تھے جو کہ مسلم تھے اور ان کا نام ذکریا تھا، لیکن اس زمانے میں ابھی بھی انگریزی نام بہت اہمیت کے سمجھے جاتے تھے۔ کمپنی کی طرف سے ذاکر صاحب کو مینجمنٹ کے کچھ کورسز کروائے گئے تھے، کہ امریکی طرز کی مینجمنٹ کا رجحان آنے لگا تھا اور برطانوی راج ہر سمت سے ڈھل رہا تھا۔ پاکستان میں امریکی عمل دخل بہت بڑھ چکا تھا۔ پاکستان کی روس سے سرحدی قربت کی وجہ سے امریکہ بھی فائدہ اٹھا رہا

تھا، اور پاکستان کی حکومت بھی فائدہ اٹھا رہی تھی، کم ازکم مستقبلِ قریب کے حساب سے۔ اسی دور میں روس نے اکتوبر ۱۹۵۷ء میں خلاء میں تاریخ کا سب سے پہلا سیارچہ چھوڑا جس کی باتیں ہر وقت ہر ایک کرتا رہتا تھا، اور کچھ مولیوں نے اس کے خلاف بیانات دیئے، کچھ نے اس کو سرے سے سچ ماننے سے انکار کیا۔ اسی طرح کراچی کے نمائش کے میدان، پرانی نمائش میں، فلپس کمپنی نے ٹیلی ویژن کی نمائش کی جسے دیکھنے سب جوق در جوق پہنچتے تھے اور ہر طرف اس کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں سوئی گیس کی دریافت کی باتیں ہر شخص کے منہ پر تھیں۔ ہم ان کے بارے میں صرف اخبار میں پڑھ سکتے تھے۔ ہمارے ہاں ڈان اور انجام اخبار آتے تھے اور بچوں کو انجام میں شائع ہونے والی رِپ کربی اور ٹارزن کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ انہی کہانیوں سے ایک جملہ مشہور ہوا..... ''پھر کیا ہوا، یہ کل کے اخبار انجام میں دیکھیئے''۔ ابنِ صفی اُس وقت کے نامی گرامی ناول نگار تھے اور فریدی حمیدی اور عمران سیریز کی کتابیں بچوں تک میں مقبول تھیں۔

دنیا اتنی تیزی سے بدل رہی تھی کہ اس کے ساتھ قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمیں ہندوستان چھوڑے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے، لیکن ہجرت کے اثرات ابھی بھی ساتھ تھے۔ ہمارے کراچی آنے کے بعد ہماری ساس، نند اور ان کی اولادیں ابھی راولپنڈی ہی میں رہ گئی تھیں۔ دوسرے ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ اپنی امّاں سے مل لیں کہ ببّا کے انتقال کے بعد ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی کیونکہ ہندوستان کا ویزے کا حصول مستقل ایک پہاڑ کی حیثیت سے حائل رہتا تھا۔ اب اس بیٹی کے پیدا ہونے کے بعد ضروری تھا کہ ہم پھر وہاں جاتے۔ ہم نے سوچا کہ ہم ایک ہی سفر میں دونوں کاموں سے نمٹ جائیں۔ لہذا ویزے کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ دارالخلافہ ابھی کراچی ہی میں تھا۔ ایک مہینہ لگا ویزا ملنے میں۔ کچھ پاکستانی رقم کو ہندوستانی روپوں میں تبدیل کروایا اور اپنے صرف دو بچوں کو ساتھ لیا۔ ایک ہمارے تیسرے صاحبزادے قمر جو کہ کلہم پانچ سال کے تھے، اور ہماری نئی صاحبزادی رعنا۔ اس مرتبہ ہم نے سوچ لیا تھا کہ زنانے ڈبّہ میں جانے کے بجائے ہمیں مردانے ڈبّے میں زیادہ آرام ہوگا۔ یہ حقیقت تھی کہ خواتین کے پاس سامان کی زیادتی اور بچّوں کی وجہ سے خواتین کے ڈبّوں میں جگہ کم ہی ملتی تھی۔

اب ہم جب اپنے ڈبّے میں پہنچے تو صرف پانچ لوگ ہمارے ہمسفر تھے جن میں ایک محترمہ تھیں جو کہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ وہ سارے راستے ایک کتاب پڑھتی رہیں اور کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ہم نے

بچوں کو کھلا پلا کے سلایا۔ تھرماس میں سے چائے لی اور ایک رسالہ نکالا۔ اتنے میں چھینکیں شروع ہو گئیں، کچھ سر بھی بھاری لگا۔ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے لگا کر دیکھا تو وہ بھی کچھ گرم سا لگا۔ ہم نے تھرمامیٹر نکالا۔ ہم بچّوں کے ساتھ سفر میں ایسی ساری ہی چیزیں ساتھ لئے چلتے تھے۔ اب منہ سے لگا کر دیکھا تو ۱۰۲ر بخار تھا۔ ان چار مردوں میں سے ایک صاحب ٹرین کے کراچی چھوڑتے وقت سے ہی ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کچھ معلوم کرنا چاہ رہے ہوں لیکن ہم نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ صاحب سامنے کی سیٹ پر سے بار بار پلٹ کر دیکھتے رہے اور اب ہم کو غصّہ آنے لگا۔ دوسری طرف بخار کچھ زیادہ محسوس ہو رہا تھا اور اب بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ حالانکہ لیٹنے کی جگہ تھی لیکن لیٹنا مشکل تھا کیونکہ سامنے یہ چاروں حضرات براجمان تھے۔ اونگھ رہے تھے مگر کھلی آنکھوں سے۔ آخر اُن صاحب سے برداشت نہ ہوا اور بولے، ''آپ رامپور جا رہی ہیں؟'' ہم کو تو رامپور کا ایک پچھلا سفر یاد آ گیا، جلدی سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور سوچا کہ کیا اب پھر سی آئی ڈی پیچھے لگ گئی۔ لیکن اب کیوں، ہمارے شوہر نے تو فوج چھوڑ دی تھی؟ ہم یہ سب سوچ رہے تھے کہ وہ پھر بولے، ''آپ گھبرائیں نہیں، دراصل جس روز آپ کو ویزا ملا تھا آپ کے ساتھ لائن میں میں بھی تھا، اتفاق سے جتنی مرتبہ انہوں نے آپ کو بلایا، مجھے بھی چکر لگوائے۔ میں لکھنؤ جا رہا ہوں۔ میری والدہ وہاں ہوتی ہیں اور یہاں ہم سب بھائی ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں''۔ ہم نے ان سے کہا، ''ہمیں لگ رہا ہے کہ ہمیں بخار ہو گیا ہے''۔ اُن دوسرے مردوں نے سنا تو بولے کہ ''ہم دوسری طرف کی سیٹوں پر چلے جاتے ہیں، آپ چاہیں تو یہاں لیٹ جائیں''۔ ان صاحب نے دوسری طرف جانے سے پہلے خدمت پیش کی، کہنے لگے کہ ''آپ پرواہ نہ کریں، بچے جاگ جائیں گے تو میں سنبھال لوں گا''۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا، پرس میں سے دردِسر کی ایک گولی نکال کے کھائی، اور چادر لپیٹ کر لیٹ گئے۔ بخار اور بڑھا اور چھینکیں بڑھتی گئیں۔ ان صاحب نے واقعی ہماری بیٹی کو سنبھالے رکھا۔ ہم اسی بخار میں حیدرآباد سے لاہور پہنچے۔

وقت کے ساتھ حالات تبدیل ہو گئے تھے۔ اب یہاں سرحد پار کرنے کے لئے واہگہ سے اٹاری تک کی ٹرین استعمال ہوتی تھی، پیدل اور ٹیکسیوں والا زمانہ نہیں رہا تھا۔ لاہور میں کسٹمز سے فارغ ہوئے جو کہ پہلے ایک چھپر کے نیچے تھا، لیکن اب یہاں پکّے دفتر بن گئے ہیں۔ اب ہم دوبارہ ٹرین میں بیٹھے۔ سارے راستے اِن صاحب نے ہماری مدد کی تھی، کسٹمز میں اور ٹرین سے اترنے چڑھنے میں بھی مستقل پورا انتظام یہی سنبھالتے رہے۔ امرتسر میں دوبارہ کسٹمز ہوا۔ یہاں ہم نے ٹرین تبدیل کی اور ہم ہاؤڑہ ایکسپریس میں

چڑھے۔ یہ اس زمانے کی مشہور ٹرین تھی اور بہت تیز چلتی تھی، اس زمانے کے حساب سے۔ ایک اور رات اس سفر میں گزر گئی۔ صبح ۷ر بجے مرادآباد کا اسٹیشن آنے لگا تو اُن صاحب نے کہا، ''باجی، مرادآباد آنے والا ہے، سامان سمیٹیں، ہم بچّوں کو کھلا پلا دیتے ہیں''۔ کمزوری اب کچھ زیادہ ہو چکی تھی۔ ہم اُٹھے، چائے پی، جلدی سے منہ اور ہاتھوں پر پانی کا پونچھا لگایا، کہ اٹھ کر باتھ روم جانے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ چائے پی اور سوچتے رہے کہ اللہ نے مددگار بنا کے ایسے ہمدرد انسان کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ راستے بھر ہماری بیٹی اُن کو ماموں کہہ کے مخاطب کرتی رہی اور ہمیں احساس ہوتا رہا کہ کاش ہمارا ایک اپنا بھی بھائی ہوتا۔

ہاؤڑا ایکسپریس امرتسر سے کلکتہ جاتی تھی اور راستہ میں مرادآباد، بریلی اور لکھنؤ وغیرہ پر رکتی تھی۔ مرادآباد اسٹیشن پر انہوں نے قلی کو بلایا اور سارا سامان حوالے کر کے اُسے ہدایات دیں۔ پھر اس بھلے مانس نے ہم سے کہا، ''باجی معاف کرنا، میں گھر تک چھوڑ آتا، مگر اب اُترا تو دوسری ٹرین کل ملے گی۔ اب خدا حافظ''۔ ہم نے اُن کا بہت شکریہ ادا کیا، کہ اُن کا اب تو ہمیں نام بھی یاد نہیں۔ اگر یہ ہمیں نہ ملتے تو نہ جانے ہم یہ سفر کس طرح پورا کرتے۔

مرادآباد سے ہمّت کر کے رامپور پہنچے، زیادہ دور تو نہیں تھا، لیکن دور لگا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ گئے تھے۔ ان کی بہت کمی محسوس ہوئی، ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ والدہ، بہن، اور بہنوئی ضامنؔ صاحب ملے۔ بہت خوشی ہوئی۔ ساتھ میں آنسو بھی نکلے۔ یہاں اس مرتبہ ہم دو ماہ کے لئے آئے تھے۔ لیکن سب سے پہلا کام اور فرض یہ تھا کہ رامپور کے تھانے میں جا کر اپنی آمد لکھوائی جائے کیونکہ پاسپورٹ میں ہندوستانی ویزے کی یہ ایک شرط تھی۔ ہم تھانے جانے کے لئے نکلے تو دیکھا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ کچھ چیزیں کم تھیں اور کچھ نئی تھیں۔ نئے اسکول اور کالج ملے، قلعہ حکومتِ ہندوستان کے پاس تھا اور پہلے تو یہاں قلعے میں صرف دو بڑے گیٹ تھے، لیکن اب کئی دروازے کھل گئے تھے۔ پہلے قلعے کے دروازوں پر پہریدار ہوتے تھے، اب ہر شخص معہ سواری بیدھڑک اندر آ جا رہا تھا۔ اسلحہ خانہ یہاں سے ہٹ چکا تھا، اور تمام پرانے مجسّمے یہاں سے ہٹا کر غالباً کسی عجائب گھر میں منتقل کر دیئے گئے تھے اور ان کی جگہ بھرنے کے لئے کچھ نئے لوگوں کے بُت اور مجسمے کھڑے تھے۔ قلعہ کے اندر رضا لائبریری ابھی بھی تھی۔ سنا تھا کہ یہاں سے قیمتی کتابیں غائب ہونے لگی تھیں اور یہ لائبریری کچھ ہندوستانی حکومت کی اپنی بددلی اور کچھ نواب کے خاندان کی اندرونی

چپقلشوں کا شکار تھی۔ جب ہم بعد میں ہندوستان گئے تو معلوم ہوا تھا کہ نواب رضا علی خاں کے داماد، اور خورشید لقا بیگم کے شوہر، پروفیسر سید نورالحسن نے ۱۹۷۵ء میں ہندوستانی حکومت سے ایک قانون منظور کروا کے اسے ہندوستانی حکومت کے حوالے کر دیا، اور اس طرح مسلمانوں کا یہ انتہائی قیمتی سرمایہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

اس کے علاوہ قلعہ کے اندر گردھی، کوڑا کچرا تھا، اور یہیں اندر ہی تھانہ بھی تھا۔ غرض یہاں رپورٹ لکھوائی کہ ہم تشریف لا چکے ہیں۔ تھانہ دار نے مروّتاً بھی چائے پانی کو نہیں پوچھا۔ واپس آئے، کچھ خریداری کی سوجھی تو برقعہ ڈالا کچھ اور ہستیوں کو ساتھ لیا اور باہر نکلے۔ رامپور کے قلعے کے آس پاس ضلعی حکومت نے دُکانیں کھڑی کر دی تھیں۔ جامع مسجد کے نیچے کی دُکانوں میں جہاں پہلے مسلمان دہلی سوداگران کی دُکانیں تھی، وہاں اب سارے سکھ نظر آئے۔ نصراللہ خان کا بازار، کچہری، اور کچہری کے اندر تک دُکانیں تھیں۔ بے روزگاری پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ ہندوستان کی حکومت کی سیاست اس طرح کی تھی کہ حکومت میں ملازمت کے لئے منعقد ہونے والے تمام مقابلوں کے امتحانات اکثر صرف ہندو آبادی کے علاقوں میں ہوتے تھے۔ غرض کچھ تھوڑی سی خریداری کی اور گھر واپس آ گئے۔ ویسے بھی اب برقعے میں چلنے کی عادت ختم ہو چکی تھی اور یہاں برقعہ پہننا پڑتا تھا۔ کچھ دن آس پاس کے سب رشتہ داروں اور واقفکاروں سے ملے۔ پھر ارادہ کیا کہ اپنے ایک رشتے کے ماموں کے ہاں آغا پور گاؤں جایا جائے۔

ماموں کے گھر پہنچے تو وہی پرانی آؤ بھگت شروع، سگوں کی طرح۔ ممانی نے کہا، ''بیٹا جو کھاؤ وہی پکایا جائے''۔ ہم نے کہا، ''مکئی کی روٹی، دال ساگ، اور لسّی''۔ کہنے لگیں، ''یہ کھاؤ گی؟''۔ ایسے کہا جیسے کہ وہ ہمیں مرغ قورمہ کھلانا چاہ رہی ہوں۔ لیکن ہمیں بہت سے بیتے ہوئے دن یاد آتے گئے تھے جب ماموں ہمیں آموں کے موسم میں دعوت دیتے تھے۔ آج ہم ٹیکسی سے آئے تھے، لیکن ہمیں بنّن بھائی کا تانگہ یاد آیا، سفید گھوڑا، چمکدار، اونچا سا جتا ہوا۔ بڑی شان سے چلتا تھا۔ اسی طرح ایک دن جب بنّن بھائی نے گھوڑے سے کہا، ''چلو بیٹا، آغا پور چلنا ہے''، تو ہم نے پوچھا، ''کیا یہ گھوڑا سمجھتا ہے؟'' بنّن بھائی بولے، ''ہاں بی بی، یہ جانور بہت پہچانتے ہیں مالک کے غصّے اور پیار کو''۔ ہم نے پوچھا، ''آپ مارتے تو نہیں اس کو؟ ہم جب لڈّن بھائی کے اکّے میں جاتے ہیں تو وہ تو اپنے گھوڑے کو بہت مارتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں''۔ وہ

بولے، ''بیٹا یہ جانور ہے، میں جانور نہیں۔ اس جانور کو ماروں تو اللہ کو حساب کیا دوں گا۔ یہ بے زبان ہے بولے گا نہیں، لیکن اوپر والا تو سب دیکھ رہا ہے''۔ اسی لئے ہمیں ان کا تانگہ بہت پسند تھا۔ سب ہی اپنے خاندان کی سواریوں کے لئے اُن کا تانگہ لیتے تھے۔ اب اس مرتبہ ہم رامپور اور آغا پور آئے تو تانگے ختم ہو چلے تھے، اکا دکا ہی تھے۔ ہم نے آغا پور کے لئے رکشہ ٹیکسی کیا جو چاروں طرف پلاسٹک سے ڈھکا ہوا تھا۔

ہمیں یاد آ رہا تھا کہ ساری بہنیں جمع، درختوں میں جھولے پڑ جاتے۔ ممانیاں اور خالائیں ہم سب کے لئے پوریاں پکا کر لاتیں۔ بچے جھولتے رہتے اور کھاتے رہتے تھے۔ ہم سب لڑکیاں گلے میں سرخ چندریاں، ہاتھوں میں گہری مہندی اور ہری کریلی بجلی کے مانند چمکدار چوڑیاں، اور چوڑیوں کے دونوں طرف کڑے ڈال کر سب کو دکھاتی پھرتیں۔ یہیں لکھنؤ کی ایک صاحبہ تھیں جن کو سب میر صاحبنی پکارتے تھے۔ بڑی حسین، لمبے لمبے سفید بال، دانت ایک نہیں، اور بہت زندہ دِل۔ بچّوں میں بچّی اور بڑوں میں بڑی لگتی تھیں۔ ہمارے گھر میں اُس وقت کوئی بوڑھا نہیں تھا سوائے اُن کے۔ یہ اب اِس جہاں میں نہیں تھیں۔ ہمیں اُن کے بارے میں مزید یادیں تازہ ہوئیں کہ اُنہیں ہمارے ماموں اور ممانی نے خاص طور پر ہمارے ساتھ ساونی میں بلایا تھا۔ ہماری بہن بھی ساتھ تھیں۔ اب یہاں پھر سے جھولے پڑے تھے۔ میر صاحبنی نے ایک تکیہ اٹھایا اور ہماری بہن سے خاص لکھنؤی انداز میں بولیں، ''چلئے بیٹا آپ بھی تکیہ اٹھائیں، پاؤں جوڑی جھولیں''۔ ہماری بہن جو ہم سے سات سال بڑی تھیں، فوراً تیار، اور جھولا جھولنے لگیں۔ یہ بڑے بڑے پینگ! میر صاحبنی کا گانا شروع ہوا۔ یہ بڑی اچھی برساتی گاتی تھیں.....

آیا برسات کا موسم میرا ڈولے ہے جیا، پیا پردیس میں ہے

یا یہ کہ.....

ایک تو پورب کی ہوا توڑے ہی ڈالے ہے بدن
دوسرے غم نے کیا مجھ کو لبِ گور سکی موسمِ برسات
موسمِ برسات آیا بولے درد مور سکی موسمِ برسات

ہم عمر میں کچھ چھوٹے تھے اور ان جھولوں پر نہیں تھے۔ ایک دو گانوں کے بعد ہم نے دھڑام سے کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا تو ہماری بہن اور وہ صاحبہ دونوں زمین پر گری ہوئی قہقہے لگا رہی

تھیں۔ جلدی سے دوسرے بڑے لوگ آئے اور اُن کو اٹھایا، لیکن اُن کی ہنسی رکے ہی نہ رکے۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد آیا کہ یہیں آغا پور کی ''کربلا'' امام بارگاہ میں ایک زمانے میں نواب کے تعزیئے دفن ہوتے تھے، اور یہ بڑے پایۂ کے انتظام کے ساتھ ہوتا تھا۔ اب یہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اب اِس زمانے میں صرف سادی سادی رسمیں ہوتیں تھیں کہ نوابیت کا دور ختم ہو چکا تھا۔

غرض انہی سوچوں سے گزرتے ہوئے ہم نے آغا پور میں اپنے ماموں اور ممانی کے گھر میں بڑا اچھا دن گزارا۔ وہ ہمارے دونوں بچّوں سے مل کر بے انتہا خوش ہوئے تھے۔ ہم واپس گھر آئے، اپنی بہن کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہر روز دوسرے روز اپنی امّاں کے پاس اُن کے لال قبر والے گھر میں جاتے۔ یہاں پر اب والد صاحب تو تھے نہیں لیکن ان کی چھتری ابھی بھی کونے میں ٹنگی رہتی تھی اور اُس کو دیکھ دیکھ کر دِل بھر آتا تھا۔ سارا دن لوگ ہم سے بھی ملنے آتے رہتے تھے۔ جب ذاکر صاحب فوج میں تھے تو مہندی خان فوج کی طرف سے ہمارا اردلی تھا۔ اُسے ہمارے بارے میں خبر ہوئی تو ہم سے سلام دعا کے لئے آیا۔ اِن بچّوں سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا، دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کئی بار انہیں تیار کروا کے لے جاتا اور کچھ گھما پھرا کر لے آتا۔ روز آنہ آتا اور کچھ نہ کچھ پھل تھیلی میں لے کر آتا تھا۔ اب یہ بھی فوج میں نہیں تھا اور رکشا چلانے لگا تھا۔ ہم سے کہتا کہ ہمیں کبھی بھی سواری کی ضرورت ہو تو ہم اسی کو بلائیں کہ وہ خود صرف کچہری کی سواریاں بٹھاتا تھا، اور ۳ر بجے کے بعد فارغ ہوتا تھا۔ اُسے اِس میں فخر تھا کہ وہ صرف کچہری کے راستے پر کام کرتا تھا کیونکہ اس طرف حکومت کے افسران اس کا رکشا استعمال کرتے تھے۔ ہم نے یہی چیز یہاں امریکہ میں دیکھی کہ ہمارے گھر کے مالی اور کاریگر اپنی بڑائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اِتنے یا اُتنے ڈاکٹروں اور وکیلوں کے گھر کام کرتے ہیں۔ کیا بات ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی اچھائی یا بلندی کے پہلو کی تلاش میں رہتا ہے کہ یہ زندہ رہنے کی خواہش کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے، اور سلیقہ بھی کہ زندگی کا ہر رنگ الگ ہے۔

رامپور میں دونوں بچے اپنے خالو، یعنی ہماری بہن کے شوہر ضامنؔ صاحب سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور انہیں اپنے خالہ زاد بھائیوں کی طرح پاپا کہا کرتے تھے۔ نانی کے گھر کم رہتے اور خالہ کے گھر زیادہ۔ خاص باغ میں انہیں روز آنہ ہرن کا یا نیل گائے کا بھنا ہوا گوشت ملتا تھا اور یہ ہمارے لڑکے کو بہت پسند تھا۔ یہ شکار کا گوشت ہوتا تھا جو ضامنؔ صاحب اور ان کے پڑوسی اکثر خود شکار کر کے لاتے تھے۔ رامپور میں

نیل گائے کو پاڑہ کہتے تھے۔

ہماری باجی اور دولہا بھائی اِس وقت اُس کوٹھی میں رہتے تھے جس میں ہم اپنی شادی کے بعد پہلی مرتبہ اترے تھے، اور نواب رامپور کی یہ کوٹھی ہمارے سسر کے پاس تھی۔ اس سفر میں ہم جب بھی باجی کے گھر رکتے، صحن میں سونے کے لئے مچھر دانیاں اور بستر وغیرہ بہت دن سے ہی کمرے سے نکال کر صحن میں رکھ دیتے۔ باجی نے ایک دن پوچھ ہی لیا کہ ہم ایسا کیوں کرتے تھے۔ ہم نے بات ٹال دی اور ہم نے انہیں یہ ہر گز نہیں بتایا کہ جس کمرے میں وہ بستر رکھتی تھیں وہ ہمارے سسرالیوں کے مطابق بھوتوں یا روحوں کا کمرہ تھا۔ یہ ہمیں اس وقت پتہ چلا تھا جب ۱۹۴۴ء کی گرمیوں میں نواب منصوری چلے گئے تھے اور ہمارے سسر جو ضرورتاً ہر وقت نواب کے ساتھ رہتے تھے، اس سال معذرت کر کے گھر رک گئے تھے۔ اُس زمانے میں ایک شام ہم اِس کمرے کی طرف سے گزرے تو ہم نے اپنے خسر کو ہاتھوں کے اشارے سے حصار کرتے ہوئے دیکھا۔ ہمارے خسر گفتگو بہت کم کرتے تھے لہذا ہم نے اپنی نند سے اس کے بارے میں پوچھا۔ تب نند نے رازداری سے بتایا کہ اس کمرے میں کچھ ارواح ہیں اور ہمارے خسر شام کو کمرے کے گرد قرآنی دعاؤں سے حصار باندھ دیتے ہیں۔ حصار باندھنے کا طریقہ ایسا ہوتا تھا کہ پڑھنے والا ایک آیت پڑھے اور ساتھ ہی ساتھ دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کو اُٹھا کر اس طرح گھمائے کے جیسے ایک رسّے کو کسی کمرے کے گرد باندھ رہا ہو۔ ہمارے خسر نے بعد میں ہمارے مذہبی رجحان دیکھ کر ہمیں بھی یہ سکھایا اور ہم اسے آج بھی استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ دعائیں تمام مشکلات کے لئے ہیں، صرف بھوتوں کے لئے نہیں۔

اس زمانے میں نواب محمد رضا علی خاں کے صاحبزادے مرتضٰی علی خاں نے نوابی کام سنبھالا ہوا تھا۔ نوابی کی اب ایک رسمی حیثیت تھی، ورنہ ریاست تو اب ہندوستان کا ضلع بن چکی تھی۔ نواب رضا علی خاں کے چھوٹے صاحبزادے سید علی خان عرف مِکی میاں نے ہندوستانی پارلیمنٹ لوک سبھا کے الیکشن میں کانگریس کی طرف سے کامیابی حاصل کی تھی۔ ان کی زوجہ، بیگم نور بانو عرف مہتاب زمانی بیگم نے ہمیں اپنے گھر دعوت دی۔ یہ اپنے سسر کے تمام ایسے جاننے والوں کو اپنے گھر میں ضرور دعوت دیتی تھیں جو پاکستان سے رامپور ملنے آتے تھے۔ بڑی اچھی خاتون تھیں، ملنسار اور مہمان نواز۔ یہ خود بھی بعد میں الیکشن میں حصہ لے کر کامیاب ہوئیں۔ بیگم نور بانو نے ہماری بہت خاطر کی اور پرانی رسموں کے مطابق ہماری واپسی کا کرایہ زبردستی ہمیں

دیا۔ پرانے وقتوں میں میزبان چاہے کتنی ہی کم آمدنی والا کیوں نہ ہو، ایک طرف کا کرایہ مہمان کو ضرور دیتا تھا، سوائے غم کے موقعہ پر۔ ایسے غم کے موقعہ پر مہمان اپنے آنے جانے کا کرایہ خود کرتا تھا۔ یہ اچھی یادیں تھیں اس سفر کی۔

ہم جب بھی رامپور گئے، کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہے کہ جس کا اثر ہماری زندگی پر ہوا۔ اس مرتبہ گئے تو ویزا تین ماہ کا تھا، مگر ایک نئی زندگی کی آمد کے سبب ہم وہاں رکنا نہیں چاہتے تھے۔ اب رامپور میں دو ماہ گزر گئے تھے اور کراچی میں ہمارے دوسرے دو بیٹوں اور بڑی لڑکی کے اسکول شروع ہونے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ ہماری والدہ مصر تھیں کہتی تھیں کہ ''یہیں رک جاؤ اور ویزا بڑھوالینا۔ اس مرتبہ تم اپنے ایک بچّے کو میرے پاس چھوڑ دو، شاید اسی وجہ سے جلدی جلدی آجایا کروگی''۔ نہ جانے کتنی باتیں کہہ گئیں وہ اِس جملہ میں۔ کیا یہ کہ ملک تقسیم ہو گیا تھا لیکن لوگوں کے دلوں کو تقسیم ہونے میں پشتیں لگتی ہیں، یا یہ کہ وہ بالکل اکیلی رہ گئی تھیں اور انہیں اپنے سامنے اپنی اولاد یا نواسے نواسیوں کے ہونے کی خواہش تھی، اور یا یہ کہ وہ ہمیں بتانا چاہ رہی تھیں کہ یہ ہماری اُن سے آخری ملاقات تھی۔ اس مرتبہ ہمارے واپس آنے کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے حتیٰ کہ ویزا بالکل بند ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہوئی۔ ہماری امّاں ۱۹۶۷ء میں ہمیں یاد کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ہم ان کے انتقال کے بعد بھی وہاں نہ جا سکے گو کہ اس وقت ہم لاہور میں تھے، اور رامپور سے ہوائی جہاز کے ذریعے ہم صرف دو گھنٹے دور تھے۔

ہم تھے مستقبل سے بے خبر، اور اسی لاعلمی میں ہم نے امّاں کو سمجھایا کہ ''امّاں ہم اتنی جلدی جلدی تو آتے ہیں پھر آپ یہ کیسے کہہ رہی ہیں''۔ انہوں نے کہا کہ ''بیٹا، ابھی خبر نہیں ہوگی، جب یہ بچّے تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہونگے تب اندازہ ہوگا''۔ بات صحیح کہی تھی اور ہمیں اس وقت تک اس کا اندازہ نہیں ہوا جب تک کہ ہمارے بچّے اسلام آباد، کراچی، کینیڈا اور کیلیفورنیا میں بکھر گئے۔ خدا کی دَین، ہماری محنتوں، اور سب سے اہم ہماری اپنی محبتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب دوبارہ سان فرانسسکو میں مل گئے ہیں۔

ہماری والدہ نے سونے کی ایک پرت بیچی اور ہماری واپسی کے ٹکٹ کا انتظام کیا۔ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہماری نانی نے ہماری امّاں کی شادی کے وقت ۲۷/روپے تولہ کے حساب سے کافی سونا خرید کے جہیز میں دیا تھا۔ یہ پیسے بنک وغیرہ میں تو رکھتے نہیں تھے، اسی طرح سونے اور چاندی کی شکل میں محفوظ رکھتے

تھے، اور جب ضرورت پڑتی، سونے کے پرت بیچے اور اپنی ضرورت پوری کی۔ اب ۱۹۵۸ء میں صورتِ حال بدل چکی تھی اور جگہ جگہ بنکوں کی شاخیں تھیں، لیکن ہماری امّاں اِس نئے ماحول کو اپنانے کی عمر پار کر چکی تھیں۔ کافی گلے ملنے اور خط لکھنے کے وعدوں کے بعد ہم رامپور سے چلے تو ببّا پھر یاد آئے جو ہمیں دہلی تک چھوڑنے آتے تھے، لیکن اِس مرتبہ ہم پورا سفر اکیلے ہی کر رہے تھے۔ ویسے بھی ان اسفار کے معاملات میں ہم اب بہت تجربہ کار ہو چکے تھے۔

رامپور سے امرتسر چار سو میل سے کم ہے لیکن ٹرینیں بدلنے کے سلسلے میں ہم تقریباً ۲۴ گھنٹے کے بعد امرتسر پہنچے۔ دو بچے، گرمیاں، اپنا سارا سامان سنبھالنا بھی ہماری ذمّہ داری، اور پھر اب ہم تقریباً ۷ ماہ امّید سے تھے۔ اب یہاں سرحد پر بھی پولیس لگنے لگی تھی۔ ہم نے تھانے میں جا کر اپنا پاسپورٹ تھانیدار کو دیا۔ انہوں نے دیکھا اور بولے کہ آپ ایک دن دیر سے آئی ہیں۔ ہم نے اسے یاد دلایا کہ ''ہم ہمیشہ اِسی تاریخ کو سرحد پار کرتے رہے ہیں جو ویزا کی آخری تاریخ پاسپورٹ پر لکھی ہوتی ہے''۔ تھانیدار مصر کہ ہمیں اس تاریخ سے پہلے ہندوستان چھوڑنا چاہیئے تھا۔ ہم نے اس سے کہا، ''سنو، ہم بالکل ویزے کی مہر کے حساب سے کام کر رہے ہیں اور شام تک لاہور میں ہونگے''۔ یہ بولے، ''نہ بی بی، شامؔ تک لَہور رکھتے، امرتسر وچ ہوانگے۔ تسی امرتسر واپس جاؤ، ادرے پیشی ہونڑی اے تواڈی مجسٹریٹ دے دفتر وِچ''۔ اب دوپہر کے ۱۲ بجے تھے، اور ہم میدان میں کھڑے تھے۔ یہ تھانے پختہ نہیں تھے بلکہ گھاس پھوس کی جھگیاں تھیں، جن میں سے اکثر کی تو دیواریں بھی نہیں تھیں۔ کچھ دفتر تو درختوں کے نیچے تھے۔ بارشیں ہوں تو پاسپورٹ کو غسلِ رخصتی مفت میں ہو جاتا تھا۔ نمعلوم دونوں ملکوں نے یہ کیوں تہیہ کیا ہوا تھا کہ اس بین الاقوامی سرحد کو سوتیلے برتاؤ سے نوازا جائیگا اور دوسرے ہوائی اڈّوں کی نمائش پر اربوں روپیہ خرچ کرنا مناسب رہے گا۔ ہم نے کافی دیر اس شخص سے گفتگو کی، دلائل پیش کئے، لیکن سب بیکار۔ تمام سرحدی چوکیوں پر پولیس اور مدخول کے کارکن ایسے ہی ہوتے ہیں، چاہے وہ پاکستان ہو یا ہندوستان، امریکہ یا سعودی عرب۔ یہ لوگ نسبتاً کم تعلیم اور کم آمدنی کے ساتھ ساتھ بہت اختیارات کے حامل ہوتے ہیں، لیکن اس صورتحال کے لحاظ سے انہیں صحیح ذمّہ دارانہ تربیت نہیں ملتی ہے۔ اب ہم اسی گرمی میں ایک تخت پر بیٹھ گئے، اور کھانے کا ناشتہ دان اٹھایا۔ یہ کھانا بے شک ۲۴ گھنٹے باسی تھا، لیکن ہمیں پتہ تھا کہ اس میں ہم نے کیا ڈالا تھا، جب کے راستوں کا کھانا کھا کر لوگ اکثر بری طرح بیمار ہو جاتے تھے۔ یہاں ہم اپنی دو سالہ بچّی کو غسلخانہ کی طرف لے کر گئے اور اپنے لڑکے کو کھانے کے

پاس چھوڑ دیا۔اُن کو کچھ بھوک تھی، اور کچھ تھکن اور کچھ بچپنے کی وجہ سے، آدھے سے زیادہ کھانا ہمارے صاحبزادے سے اُلٹ گیا۔ہم نے خشک پوریوں اور حلوے سے گزارا کیا، اور قریب کے نلکے سے پانی پلایا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا کریں کہ اتنے میں قریب سے ایک لڑکی ہاتھوں میں فائلیں دبائے ہوئے گزری۔ہمیں دیکھ کے ٹھٹک کر رکی اور پوچھنے لگی، ''آپ گئیں نہیں ابھی تک، میں صبح سے دیکھ رہی ہوں آپ کو یہاں؟''۔ہم نے انہیں تفصیل بتائی۔ یہ ہم کو اپنے ساتھ اندر تھانیدار کے پاس لے کر گئی اور اس کو پاسپورٹ دکھا کر ان سے کہنے لگی، ''یہ بالکل قائدے کے مطابق آئی ہیں اور صحیح تاریخ پر ہندوستان چھوڑ رہی ہیں۔آپ انہیں جانے دیں''۔تھانیدار اپنی اڑی پر رہا تو اس لڑکی نے ہم سے کہا، ''آپ یہاں بیٹھیں، میں آدھے گھنٹے میں واپس آتی ہوں''۔ابھی یہ لڑکی باہر گئی ہی تھی کہ تھانیدار پنجابی میں کچھ یہ کہنے لگے، ''بی بی تسی وکت نہ خراب کرو۔سامنے چھپر تھلے اوس بندے نال ماملہ طے کرلو، کام ہو جائے گا''۔ہم باہر آئے اور قلی کو سامان لے چلنے کی ہدایت دی تو اس نے کہا، ''بی بی جی، انہیں کچھ پیسے دے کر جان چھڑاؤ، یہ روز آنہ ہر ایک کے ساتھ یہی کرتے ہیں''۔ہم نے اس چھپر کے نیچے والے سپاہی کو پیسے تو نہیں دیئے، اپنا بچا ہوا ادرک کا حلوہ اور رامپور کے آم جو ہماری والدہ نے ہمارے ساتھ کر دیئے تھے، ان کے حوالے کر دیئے۔یہ سپاہی اس کو لے کر اندر گیا اور فوراً واپس آ گیا کہ اس سے کچھ نہیں ہوگا، کچھ اور دو۔ہم دوبارہ اندر واپس آ گئے اور پورا پرس کھول کر تھانیدار کے سامنے الٹ دیا اور کہا، ''اس میں سے آپ جو مناسب سمجھیں رکھ لیں، بس ہمیں لاہور کے ٹکٹ کے پیسے واپس دے دیں''۔تھانیدار بڑی بے دلی سے پیسوں اور زیورات کو دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا، ''اے کی اے۔مجسٹریٹ دے دفتر وچ اس نال دگنا خرچا آنا ہے۔تسی کُج ہور تلاش کرو''۔اُس شخص کو ابھی امید تھی کہ ہمارے سامان میں مزید پیسے اور زیورات ہونگے۔ہم نے اس سے کہا، ''ہم نے پہلے کبھی رشوت نہیں دی، لیکن پھر بھی آپ کے سامنے کئی سو کے تو صرف زیور ہیں، آپ بولیں''۔ ابھی یہ معاملہ جاری تھا کہ دیکھا ایک صاحب لپک جھپک کر سفید دھوتی پہنے ہوئے اندر داخل ہوئے، ہمارا پرس اٹھایا اور ہمیں دے دیا۔ہمارے کاغذات اور پاسپورٹ دیکھے، اور تھانیدار سے لے کر سپاہیوں تک کو خوب سناڈالیں۔وہ سب ہاتھ باندھے ''سر جی، سر جی'' کرتے رہے۔ یہ نئے صاحب کوئی اوپر کے عہدیدار تھے اور اس لڑکی نے ان سے تھانیدار کی شکایت کی تھی۔یہ ہمیں باہر لائے، اور قلیوں کو بلا کر ہمارے سامان کا انتظام کیا۔ہمیں سامان کے لئے قلیوں کے نام کی پرچیاں لکھ کر دیں۔ان پرچیوں کا انتظام اس طرح تھا کہ آپ پیسے پہلے دیں، پرچیاں لیں اور قلیوں

کو دیں۔اس سے پہلے ہم نے کبھی یہ نہیں کیا تھا اور ہمیں اندازہ ہوا کہ گذشتہ اسفار میں اس طرح قلیوں نے ہم سے بہت زیادہ پیسے وصول کئے تھے۔ پھر یہ ہمیں نمستے کر کے جانے لگا تو ہمارے منہ پر خدا حافظ آتے آتے رک گیا اور ہم نے جواباً کہا، ''آداب بھائی صاحب''، اور دِل سے شکریہ ادا کیا۔تھوڑی ہی آگے وہ لڑکی دوبارہ مل گئی جس نے ہمارا کام نکالا تھا۔ہم نے ان کا بھی شکریہ ادا کیا۔سوچنے لگے کہ یہ فرشتہ اور فرشتی جو ہمارے کام آئے اس وقت، کتنے نیک ہندو تھے۔

اٹاری سے سرحد پار کر کے واہگہ پہنچنے کے لئے تقریباً ۱۸ رمیل چلنا پڑتا تھا یا ٹیکسی کرنا پڑتی تھی۔ہم نے ڈر سے ٹیکسی کے بجائے تانگے کو پسند کیا۔قلیوں کو پرچیوں کے علاوہ بھی کچھ پیسے اور دیئے کیونکہ یہ سارا دن ہمارے ساتھ رہے تھے اور ان ۳ رروپوں میں ان کا کیا بھلا ہوتا۔ یہ سکھ قلی شرنارتی تھے جنہیں پاکستانی پنجاب سے نکالا گیا تھا، اور ہندوستان میں یہ شرنارتھی کہلاتے تھے۔ان کا بھی بہت پتلا حال تھا۔لاہور کی آخری ٹرین واہگہ سے شام کے ۴ ربجے چلی اور آدھے گھنٹے میں ہم لاہور میں تھے۔اسٹیشن پر مسافروں کی انتظار گاہ میں دم لیا، سب کا منہ ہاتھ دھلایا، چائے پی اور حلیہ درست کیا۔اسی میں شام ہونے لگی۔

ہم نے ٹرین کے انتظار کرتے ہوئے گھڑی کی طرف نظر ڈالی تو شام کے ۷ ربج چکے تھے۔اتنے میں قلی نے آ کے ہم سے کہا، ''بی بی، آپ پلیٹ فارم سے باہر ٹرین کے ڈبوں میں ابھی سے بیٹھ جائیں ورنہ جب یہ ڈبّے پلیٹ فارم پر آئیں گے تو اس پر سب ایک ساتھ حملہ کر دیں گے''۔ہم نے حامی بھر لی۔ چلے تو قلی کے قدم سے قدم ملانا مشکل لگ رہا تھا۔ یہ سر پر سامان رکھ کر بھی ایسے تیر کی طرح جاتے ہیں کہ پیچھا کرنا مشکل۔ہم بھی لپک جھپک کر چل رہے تھے یا بھاگ رہے تھے۔اتنے میں سامنے دیکھا تو لگا کہ ہمارے جاننے والے ایک محترم شہنشاہ نواب چلے آ رہے ہیں۔ یہ ہماری ساس کی ایک منہ بولی ''دوپٹہ بدل'' بہن کے صاحبزادے تھے جو بعد میں لاہور ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر رہے اور بانیوں میں شمار ہوئے۔ہم نے زور سے انہیں آواز دی، ''ارے بھائی! تم کہاں؟ کیسے ہو؟'' انہوں نے ہمیں دیکھا اور ایسا لگا کہ ہمیں جانتے نہ ہوں۔ اب ہم نے غور سے دیکھا تو یہ شہنشاہ نواب صاحب تو نہ تھے۔شہنشاہ لاہور میں رہتے تھے، اور ہم شاید ان کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اس تھکن میں اور بھی کسی جان پہچان والے کی تلاش رہتی ہے۔ بہرحال ہم سٹپٹا گئے اور فوراً بولے، ''ارے بھائی! آپ کی صورت ہمارے بھائی سے بہت ملتی ہے، ہم آپ کو دور سے اپنا بھائی

سمجھے تھے''۔ یہ صاحب کہنے لگے،''میں شہنشاہ نواب نہ صحیح ،لیکن ہوں میں بھی لکھنؤ کا ، یہاں واہ فیکٹری میں ہوں''۔ یہ صاحب پنڈی جا رہے تھے۔ ہم نے ایک دو معذرتی جملے کہے اور آگے بڑھ گئے۔قلی سامان لئے ہوئے پلیٹ فارم سے نیچے اترے اور تھوڑا آگے جا کر ایک ڈبّے میں چڑھ گئے۔ہم بھی یہاں آ گئے۔انہوں نے ایک نشست پر ہمارا بستر لگانے میں مدد دی، اور ہم نے انہیں پیسے دے کر فارغ کیا۔اس طرح قلیوں کا فائدہ یہ تھا کہ ان کے مسافر کو جگہ ملتی تھی تو مسافر ان کو پیسہ زیادہ دیتے تھے، اور یہ جلدی فارغ ہو کر دوسری سواری پکڑتے تھے۔ابھی یہ لوگ اُترے ہی تھے کہ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ انجن لگا، اور تھوڑی ہی دیر میں یہ ٹرین رینگتی ہوئی ،سلوموشن میں پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ یہاں اس کو آدھے گھنٹے رکنا تھا۔ ہمارے ڈبّے میں ایک صاحب اپنی صاحبزادی کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہم کراچی جا رہے تھے۔ ہمارا جواب سن کر اپنی بیٹی ہمارے حوالے کی کہ ہم اسے اپنی حفاظت میں کراچی لے جائیں، اس کا بچہ بیمار ہے۔اس لڑکی کا ٹکٹ بھی ہمارے حوالے کر دیا، اور خود یہ جا وہ جا۔تھوڑی ہی دیر میں یہ پھر واپس آئے تو ساتھ میں چائے اور بسکٹ بھی تھے۔ہمیں دیئے اور ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہم پر اعتماد کر بیٹھے تھے۔ہم حیران ہوتے رہے، لیکن اس زمانے میں جرائم بہت کم تھے اور لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کر لیتے تھے۔ یہ صاحب ہمیں ہماری لے پالک مسافر حوالے کر کے پھر فوراً ہی چلے بھی گئے۔

یہ صاحب ابھی نظروں سے اوجھل بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ شہنشاہ نواب نما ہستی دوبارہ ہماری طرف آئے ،اور ساتھ میں ٹرین کے ڈائننگ روم کا ملازم ایک ٹرے سنبھالے ہوئے آیا۔ملازم نے چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے ہمارے سامنے رکھی تو ہم نے کہا،''یہ کیا ہے بھائی؟''وہ صاحب بولے،''بھائی بھی کہہ رہی ہیں اور اعتراض بھی کر رہی ہیں۔ایک بھائی چلتے چلتے چائے ہی پلا سکتا ہے۔اب آپ کو یہ پینا ہی پڑے گی''۔اب ہم کچھ حیران، لیکن وہ ٹرے چھوڑ کر ڈبّے سے اتر گئے۔ہم نے اپنی لے پالک مسافر اور دوسری خواتین کو بھی دعوت دی کہ وہ بھی کچھ کھا لیں اس میں سے۔ ہماری لے پالک خاتون کڑک کر ہم سے بولیں،''یہ کون تھا؟''ہم نے کہا،''آپ سن تو رہی تھیں''۔ کہنے لگیں،''اے ماری ہوتی چائے اس کے منہ پر''۔ہم نے کہا،''اب تھوڑی سی چائے پی لیں، کچھ بچی تو اس کے منہ پر ماردیں گے''۔سب ہی نے ایک ایک پیالی چائے پی، پھر ہم نے اس ملازم بیرا کو چائے کی ٹرے واپس لے جانے کے لئے کہا۔ یہ غریب بھی ابھی تک یہیں کھڑا تھا۔اب ٹرین چلنا شروع ہوئی اور ہم نے آس پاس کی دوسری خواتین سے بات چیت شروع

کی تو اندازہ ہوا کہ ہماری لے پالک خاتون سیدھی ہی نہیں، بلکہ اچھی خاصی کھسکی ہوئی تھیں۔

ہم نے ان سے بات چیت کرنا شروع کی اور پوچھا کہ وہ بچّے کے بغیر کیسے آ گئیں، تو جواب میں انہوں نے ہم سے ایک پان کی فرمائش کی۔ ہم نے انہیں پان کی ڈبیہ سے پہلے سے بنا ہوا پان دینا چاہا تو انہوں نے ہم سے پرزور فرمائش کی کے پان تازہ بنا ہونا چاہیئے۔ ہم نے پاندان نکالا، اور ان کو پانوں کی ڈھولی دکھائی۔ ان کے پوچھنے پر انہیں بتانا پڑا کہ پانوں کی ڈھولی اس طرح بنتی تھی کہ ڈھائی یا تین سو پانوں کو اکٹھا رکھیں، پھر انہیں بڑے پتّوں میں لپیٹ لیں اور ایک تنکا اُڑس کر اسے بند کر دیں۔ اس طرح پان دیر تک تازہ رہتے ہیں کیونکہ ان کا پانی باہر نہیں نکلتا۔ لیکن زیادہ دیر اس طرح رکھیں تو پانی سے پان گل بھی سکتے ہیں۔ ہمارا پاندان بالکل نیا تھا، لیکن ہم نے اس میں کتھا اور چونا اس لئے ڈال لیا تا کہ یہ پرانا لگے ورنہ کسٹم والے اس پر قبضہ کر لیتے۔ اب ان خواتین نے سارے راستے مانگ مانگ کر اتنے پان کھائے کے کراچی تک ایک چوتھائی پان غائب تھے۔

کراچی آیا، ہم نے اپنے شوہر کو اطلاع نہیں کی تھی کہ صحیح معنوں میں نہ ڈاک کا بھروسہ تھا، نہ یہ کہ کوئی ٹرین جو ہمیں لینا ہو ہمیں مل ہی جاتی۔ خط میں پوسٹ کارڈ استعمال کرتے تھے، پھر اس میں بھی کفایت شعاری۔ ہم جیسی خواتین کے لئے اس کفایت شعاری کے ساتھ سفر کرنا بہت ہمت کی بات تھی۔ اس زمانے کے سفر سب اللہ کا نام لے کر کرتے تھے۔ غالبًا ہماری لے پالک ذمّہ داری میں یہ خاتون بھی اسی طرح چلی تھیں۔ ان صاحبہ کو گورا قبرستان کے پیچھے کہیں جانا تھا، اور ہماری ذمّہ داری صرف کراچی کینٹ اسٹیشن تک تھی۔ ہم نے ان کا پتہ وغیرہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر کے انہیں اس میں بٹھانا چاہا تو یہ ڈر کے مارے اس میں نہ بیٹھیں۔ ہم بڑی مشکل میں تھے۔ رات کے ۸ بجنے لگے تھے اور ہم ۴۸ گھنٹے سے بچّوں کے ساتھ سفر پر تھے، پھر ہمیں خود ناظم آباد جانا تھا۔ مگر نہیں، ان صاحبہ کو ضد تھی کہ ہم انہیں کم از کم گورا قبرستان تک چھوڑ کر آئیں، اور وہ بھی تانگہ پر، ٹیکسی پر نہیں۔ غرض ہم نے ان کی ضد پوری کی، اور انہیں گورا قبرستان پر اتارا، ایک رکشا روکا اور اسے ان کے گھر کا پتہ دے کر روانہ کیا۔ یہاں سے انہیں اپنے گھر کے راستہ کی خبر تھی۔ ہم خود جب گھر پہنچے تو رات کے ۱۱ بج رہے تھے۔ سب حیران، لیکن ہمارے پاس تفصیل بتانے کی ہمّت نہ تھی۔

سولہواں سفر ۔ کراچی کی باتیں

رامپور سے آنے کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی ستمبر ۱۹۵۸ء میں ہمارے چوتھے صاحبزادے اعزاز پیدا ہوئے۔ یہ بھی انکوائری آفس کے اُسی ہسپتال میں پیدا ہوئے جہاں ان سے پہلے ہماری بیٹی رعنا پیدا ہوئی تھیں۔ رات کو جب ہمیں اُن کی ولادت کے سلسلے میں ہسپتال جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سوال یہ تھا کہ گھر پر کون رُکے اور ساتھ میں کون جائے۔ سب ہی بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ ذاکر صاحب اور ہم نے اپنے دوسرے لڑکے شمس کو ساتھ لیا جو اسی دن ۷/سال کے ہوئے تھے۔ صاحبزادے نے ہاتھ میں ایک لالٹین پکڑی کیونکہ راستہ میں کہیں بجلی کی روشنی نہیں تھی، اور اس طرح ایک میدان پار کر کے پیدل ہسپتال پہنچے۔ سب لڑکوں کے لئے ایک اور کھلونا آ گیا، اور ہماری بیٹی رعنا بھی خوش ہو گئیں کہ اب ان سے چھوٹا بھی ایک اور تھا۔

ان صاحبزادے کے پیدا ہونے کے ایک ہی ماہ بعد جنرل اسکندر مرزا نے جنرل ایوب خان کی معرفت پاکستان میں مارشل لاء لگا دیا۔ کراچی میں اس کی سختی باقی سارے ملک سے کہیں زیادہ تھی۔ کوئی سڑک پر تھوکے بھی تو فوجی اس کو پکڑ کر اسی سے صاف کرواتے تھے۔ مہاجروں پر مارشل لاء کا زیادہ زور تھا۔ لیکن لالچ بری بلا ہے۔ جنرل ایوب خان نے جب دیکھا کہ جنرل مرزا کو مارشل لاء لگوانے کے لئے اُن کی ضرورت پڑی تو انہوں نے سوچا کہ یہ پورا پھل خود کیوں نہ کھایا جائے۔ لہذا جنرل مرزا باہر اور جنرل خان صاحب صدرِ پاکستان، مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور فوج کے کمانڈر انچیف بن گئے۔ قوم ان کی صدارت سے بہت خوش تھی کیونکہ اس سے پہلے خواجہ ناظم الدین سے لے کر جنرل اسکندر مرزا تک حکومتیں کیلنڈر کے صفحوں کی طرح بدل

رہی تھیں، اور ایوب صاحب کے آنے کے بعد نہ صرف انہوں نے ڈنڈے کے زور پر حکومت سنبھالے رکھی، بلکہ صنعتی ترقی بھی کروائی۔ ان کے زمانے میں امریکی نائب صدر لنڈن جانسن، امریکی خاتونِ اوّل جیکو لین کینیڈی اور برطانوی ملکہ الزبتھ کراچی آئیں۔ اس کے ساتھ ہی جنرل ایوب خان کے اسکینڈل بھی اخباروں میں آنے لگے۔

جہاں یہ سلسلے چل رہے تھے وہاں ہمارا گھر امریکہ کے ایلس آئلینڈ کی جیسی حیثیت برقرار رکھے تھا۔ ہمارے سارے سسرالی ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ہمارے شوہر کے چچازاد بھائیوں کی اولادوں سے لے کر ہماری نند کا خاندان اور ان کے صاحبزادوں کے دوست، اور غرض یہ کہ جو بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے، ہمارے گھر کے دروازے اس کے لئے کھلے تھے۔ ہماری رشتہ کی ایک خالہ اور ان کا لڑکا اور لڑکی بھی کراچی آ گئے تھے۔ ان کی شادیاں ہمارے گھر سے ہوئیں، اور یہ لوگ شادیوں کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

راولپنڈی سے کراچی آنے کے بعد ذاکر صاحب کے قریبی رشتے دار بھی شروع میں ہمارے ساتھ ہی رہے۔ ہماری نند کے دوسرے صاحبزادے پاکستانی فضائیہ میں شامل ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے سرگودھا، سیالکوٹ، ملتان، اور بنّوں میں تعینات رہنے کے بعد ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈّہ پر تعینات ہو گئے اور ان کو وہاں گھر مل گیا۔ اس کے ساتھ ہماری نند وہاں چلی گئیں۔ یہ ڈرگ روڈ کی سڑک اب شارع فیصل کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی دوران ہمارے جیٹھ مشرقی پاکستان سے کشمیر چلے گئے۔ انہیں کشمیر کی حکومت کی طرف سے مظفر آباد کے قریب چھتر کلاس میں ایگریکلچرل آفیسر کی حیثیت سے شمولیت کی دعوت ملی تھی۔ اب یہ یہاں آئے تو انہوں نے اپنی بیٹی کی واپسی کی بات شروع کی۔ نہ جانے وہ کب سے یہ دل میں رکھے تھے اور ہم بھی انہیں اور ان کی بیگم کو داد دیتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ ہم نے بھی دل پر پتھر رکھ کر اپنی تسنیم کو جانے دیا۔ ہم نے اسے ۱۹۴۵ء میں لیا تھا اور اب یہ تقریباً ۱۳/سال سے ہمارے پاس تھیں۔ ہم سب بہت اداس تھے اور خاص طور سے بچّے، لیکن یہ مرحلہ ہمیں بہرحال طے کرنا تھا۔

کراچی کا موسم بالکل بے اعتبار تھا۔ نہ گرمی راولپنڈی جیسی تھی اور نہ سردی۔ بارشیں بھی کم ہوتی تھیں۔ ان بارشوں میں موسم اچھا ہو جاتا تھا، اور سارا دن بچے سرخ رنگ کی بیر بہوٹیاں پکڑ کر ایک شیشی میں

جمع کرتے رہتے تھے۔ یہ کیڑے یا پسو بچوں کے ناخن کے برابر ہوتے ہیں اور ان کے جسم پر سرخ رنگ کے باریک چمکدار بال ہوتے ہیں۔ بیر بہوٹیاں سارا سال زمین کے اندر چھپی رہتی تھیں اور بارش کے بعد تھوڑی دیر کو باہر نکلتی تھیں کہ یہ بچے انہیں دھر لیتے تھے۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی رہی، یہ بیر بہوٹیاں کراچی سے غائب ہوتی گئیں اور اب ہم نے کوئی بیس سال سے یہ نہیں دیکھی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کہ انسانی آبادی کی بڑھوار کا شکار ہوگئیں یا پٹرول اور دوسری نقصان دہ اشیاء کے استعمال میں زیادتی کا۔

کراچی ۔ یہ بیر بہوٹی اب نظر نہیں آتی

کراچی میں بارشوں کے پانی کے نکاسی انتظام ابھی اتنا اچھا نہیں تھا۔ اُس پر یہاں کی زمین ریتیلی اور پتھریلی تھی جس کی وجہ سے پانی کے زمین میں جذب ہونے کی کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ جو بارش ہو، پانی ندی نالوں میں جائے اور ذرا سی بھی تیز بارش ہوتی تو طوفان بپا ہو جاتا تھا۔ جون ۱۹۵۸ء میں کراچی میں زبردست بارشیں ہوئیں۔ اس قدر کے ایک ہی دن میں ۴ر یا ۵ر انچ بارش ہوئی اور تمام ندیوں میں پانی چڑھ آیا۔ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر پناہ لینے کے لئے باہر نکلے، اور اسی میں ہماری وہ خالہ اور خالو، کہ جن کے بچوں کی شادی کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، پانی کے زور میں بہہ کر سمندر میں چلے گئے۔ بیسیوں لوگ پانی کے ریلے سے ندیوں میں چلے گئے تھے اور بوڑھے اور کمزور لوگ اس میں زیادہ تھے۔ ہمارے خالہ زاد بھائی بہت اچھے تیراک تھے اور یہ صاحب کتنی ہی دیر اپنے والدین کے پیچھے پیچھے ناظم آباد کی ندی سے ہوتے ہوئے لیاری ندی تک انہیں پکڑنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ کتنے ہی دوسرے لوگ بہہ گئے تھے۔ کئی دن بعد تک بحریہ کے سپاہی اور پیراک سمندر میں جال ڈال کر ڈوبنے والوں کی لاشیں برآمد کرتے رہے۔ ان کی پانی سے پھولی ہوئی لاشیں مسجدوں میں رکھ دی جاتی تھیں۔ ہم اور ہمارے خالہ زاد بھائی صبح سے شام تک ان مسجدوں میں جاتے۔ آخر کار ان میں ہماری خالہ کی لاش برآمد ہوگئی۔ ہم اسے صرف ان کے ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی کی وجہ سے پہچان سکے ورنہ ان کا جسم پانی سے بہت پھول چکا تھا اور پہچاننے میں نہیں آرہا تھا۔ خالو کی لاش پھر بھی نہ ملی۔ ایسی بارشیں ہم نے ہندوستان میں دیکھی تو تھیں، لیکن ایسے سیلاب کم ہی دیکھنے میں آئے تھے۔

اسی سال ہم مسلم لیگ کالونی سے عثمانیہ کالونی میں آئے۔ یہاں بھی عجیب حساب تھا۔ ہمارے گھر

کے پیچھے کی سڑک پار کریں تو رضویہ کالونی تھی جہاں تقریباً ۱۰۰ر فیصد شیعوں کی آبادی تھی۔ وہاں سنّیوں کے لئے گھر خریدنا یا کرایہ پر لینا تقریباً ناممکن تھا۔ سڑک کے اس پار عثمانیہ کالونی کا نام ہی رضویہ کالونی کے مقابلے کا تھا۔ یہاں اکثریت اہلِ حدیث کی تھی۔ ہماری قسمت کہ ہمیں یہاں گھر لینے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ رضویہ کالونی کی امام بارگاہ ہمارے سامنے بننا شروع ہوئی، اور ہمارے وہاں رہنے کے دوران ہی مکمل ہوگئی تھی۔

کراچی ۔ رضویہ امام بارگاہ

لوگوں کے مشغلوں میں بالکل سیدھی سادھی چیزیں تھیں۔ اسی دوران ہماری نند کے سب سے چھوٹے صاحبزادے نے دوسروں کے دیکھا دیکھی رضویہ امام بارگاہ کے سامنے کے میدان میں ۱۰ار گھنٹے بغیر اترے سائیکل چلائی۔ بعد میں ان سے بات چیت کی تو اندازہ ہوا کہ پہلے ۸ر سے ۱۰ر گھنٹے تو ان کو کافی محنت کرنا پڑی تھی، لیکن اس کے بعد ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہوگئی تھی اور سائیکل اور پورا جسم ایک دوسرے کا حصہ بن گئے تھے۔

یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ اس وقت کراچی میں صاحبزادہ یعقوب علی خاں کی شادی کے موقعہ پر نواب رضا علی خاں کراچی آئے۔ ان کے ساتھ ہمارے دولہا بھائی اعجاز حسن ضامنؔ بھی کراچی آئے۔ یہ ان کا واحد سفر تھا پاکستان کا، اور درحقیقت ہندوستان کے باہر وہ اور کہیں نہیں گئے سوائے پاکستان کے اس سفر کے۔

یہاں پر بھی ایسی سختی کہ ان کا پاسپورٹ نواب کے سابق ہوم سیکریٹری کے پاس رہا۔ اُنہیں باہر آنے جانے کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ یہ لوگ اپنی جگہ مصروف تھے اور ان دنوں ہم بھی اپنی مصروفیات میں گھرے ہوئے تھے۔ پھر بھی ضامنؔ صاحب نے وقت نکالا اور ہمارے گھر آئے، صرف دو گھنٹے کے لئے۔ اس میں سے بھی اکثر وقت ہمارا گھر تلاش کرنے میں نکل گیا کیونکہ کراچی میں نہ تو نقشہ جات ہوتے تھے اور نہ ہی گلیوں اور سڑکوں کے نام۔ بس سڑک کے ہر موڑ پر سواری روکی، اور پوچھتے رہے کہ اس نمبر کا گھر کہاں ہے۔ تھوڑی ہی دیر بیٹھے تھے کہ واپس جانے کا وقت ہوگیا۔ ہم نے ان سے دوسری معلومات کیں، معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی بیگم کو بھی ہم سے ملنے کی خواہش تھی، لہذا ہم نے ان سے آنے کا وعدہ کیا اور ایک دن درحقیقت ہم ان سے ملنے کو پہنچے۔ بیگم صاحب سے مل کر خوشی ہوئی اور وہ بھی ہمیں دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ اب وہ پہلے جیسی حکومت تو نہیں تھی، لیکن رکھ رکھاؤ ابھی بھی پرانا تھا۔ وہاں ضامنؔ صاحب سے ایک بار اور ملاقات ہوئی، اور پھر دو گھنٹے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ یہ ضامنؔ صاحب سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ ۱۹۵۸ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں کشیدگی عروج پر رہی اور دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ نواب رضا علی خاں خود بھی ۶/ مارچ ۱۹۶۶ء کو انتقال کر گئے تھے۔ وہاں بھی نسلیں بدل رہی تھیں، ہمارے ہاں بھی، اور پرانے تعلقات اور روائتیں اب ڈھلنے لگی تھیں۔ اِن تمام وجوہات سے ہماری بہن کو خاص باغ پیلس میں نواب رضا علی کی طرف سے ملی ہوئی کوٹھی چھوڑنا پڑی، اور ہماری ذاتی تاریخ کا یہ ایک پہلو مستقلاً ہماری پہنچ سے نکل گیا کہ اسی کوٹھی میں ہم شادی کے بعد پہلی مرتبہ اترے تھے۔ انہیں دوسرا گھر دھوبی گھاٹ کے پاس ملا اور یہ لوگ ابھی بھی وہیں مقیم ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ضامنؔ صاحب بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔

کراچی بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اب ہندوستان سے مسلمانوں کے آنے پر پابندی لگ چکی تھی اور ایوب خان کے دور میں دوسرے صوبوں سے اس قدر ہجرت ہوئی کہ کراچی کے تمام شہری وسائل اس کی آبادی کے لئے بہت کم پڑ گئے۔ افراتفری اور جرائم میں ایک دم اضافہ ہوا۔ پھر کراچی میں پولیس بھی کراچی کے لوگوں کی نہیں رہی اور کراچی کا نظام قطعیٔ درہم برہم ہوگیا۔ ہم نے اگلے ۷/سال میں چوری چکاری اور رشوت بے حساب بڑھتے دیکھی اور اس کے بعد ہر حکومت پچھلی حکومت سے چوری، غبن، اور رشوت میں بڑھ چڑھ کر آئی۔ کراچی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی دورنگی سرخ اور پیلی پٹّی کی بسوں کی جگہ نئی چمکدار رنگ برنگی بسوں نے لے لی۔ بسوں کے لئے لگنے والی قطاروں کی جگہ دھکّم پیل نے لے لی۔ جس میں طاقت ہو وہ بس

میں، اور کمزور نیچے اور کبھی کبھی بس کے پہیّوں کے نیچے آنے لگے۔ بسوں میں یہ تبدیلی جنرل ایوب خان کا کارنامہ تھا جو اپنے حامی حواریوں کی تجارت کراچی میں چمکانا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد لے جایا گیا جو جنرل ایوب خان کے اپنے دیہات ''ریحانہ'' کے علاقہ میں تھا۔ ان تمام واقعات سے کراچی کے لوگوں میں غیریت کا احساس بیٹھتا گیا اور پھر ایسا لگنے لگا کہ کراچی پاکستان سے ایک الگ ہستی ہے۔ اس تباہی میں سب نے اپنی قابلیت کے حساب سے حصّہ لیا، اور اس میں ہر عقیدے، گاؤں، زبان، اور صوبے نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پھر یہاں کے تعلیمی اداروں کو سیاست اور فیڈرل حکومت نے بالکل تباہ کر دیا۔ ساری سیاسی ہنگامہ بازی کراچی میں منتقل ہوگئی۔ نتیجتاً یہاں تعلیمی اور صنعتی بحران بڑھا جس کی وجہ سے پڑھے لکھے لڑکے ملک چھوڑ کے باہر جانے لگے۔

پی آئی اے کا بوئنگ ۷۰۷۔ ''روایت'' ہے کہ یہ ایشیا کی کسی بھی ایئر لائنز کا سب سے پہلا جیٹ طیارہ تھا۔

اسی میں ہماری نند کے دوسرے صاحبزادے ذکی محمد تھے جنہوں نے پاکستانی فضائیہ چھوڑ کر انگلستان جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم سب انہیں چھوڑنے کراچی ایئرپورٹ گئے۔ اس وقت یہ صرف کراچی ایئرپورٹ کہلاتا تھا، قائدِ اعظم ایئرپورٹ بعد میں کہلایا۔ ذکی جس جہاز میں گئے وہ پی آئی اے کا پہلا اور بالکل نیا، چمکتا ہوا بوئنگ ۷۰۷ طیّارہ تھا۔ رات کو ایئرپورٹ ٹرمینل سے رن وے کی طرف جاتے ہوئے یہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہمیں بس یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ زمین سے اٹھ بھی سکے گا۔ ہمیں اپنا ڈکوٹا جہاز کا سفر یاد آیا۔ وہ جہاز اس بوئینگ کے ایک پر سے بھی چھوٹا تھا۔ ذکی کے جانے کے بعد ہماری نند اور ساس ڈرگ کالونی سے واپس ہمارے ساتھ عثمانیہ کالونی میں منتقل ہوگئیں۔

۱۹۶۱ء میں پاکستان میں بہت تبدیلیاں آئیں۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے جو انگریزوں کے زمانے سے پاکستانی ٹرینوں کی کمپنی تھی، اِس سال سے پاکستان ویسٹرن ریلویز کہلانے لگی۔ جون ۱۹۶۱ء میں پاکستان نے کراچی کے پاس سے رہبرِ اوّل نام کا پہلا موسمی راکٹ چھوڑا جو پورا فرانسیسی تھا لیکن اس سے پاکستان میں راکٹ کی بنیاد پڑی اور یکے بعد دیگرے رہبرِ دوئم، رہبرِ سوئم اور شہباز راکٹ جانا شروع ہوئے۔ بس پھر کیا تھا، ہر تیز جانے والی سواری کا نام ان راکٹوں کے نام پر رکھے جانے لگے۔ عزیز آباد سے چلنے والی بسوں کے

نمبر تو اپنی جگہ، ان کے نام بھی رہبرِ اوّل، رہبرِ دوئم وغیرہ تھے۔ یہ بسیں ان راکٹوں سے زیادہ تیز چلتی تھیں، روزآنہ حادثات کرتی ہوئی۔ اسی سال پاکستان کا پیسوں کا نظام تبدیل ہوا اور اب ایک روپیہ میں ۶۴/ پیسوں کے بجائے ۱۰۰/ پیسے ہونے لگے۔ آنے کا حساب ختم ہوا، اور ایک آنے کی جگہ اس شکل کا دس پیسے والا ایک بڑا سکّہ چلا جسے لوگ دسّہ کہنے لگے۔ یہ مہنگائی کی ابتداء تھی کیونکہ بہت جلدی بسوں کا کرایہ ایک آنہ کی جگہ دس پیسہ اور دو آنے کی جگہ پندرہ پیسہ ہوگیا، کہ ان سکّوں کو بس میں تبدیل نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اِسی سال عثمانیہ کالونی میں ہماری دوسری صاحبزادی سیما پیدا ہوئیں اور ہم عثمانیہ کالونی کا گھر چھوڑ کے عزیز آباد کی نئی کالونی کے گھر میں منتقل ہوگئے۔ یہ اچھا صاف ستھرا اور نیا علاقہ تھا، اور ان گھروں میں ٹائل کے فرش تھے۔ یہاں بجلی بھی تھی اور فلش سسٹم تھا، جو کہ کراچی کے تمام نئے گھروں میں اس وقت قانوناً لازمی کر دیا گیا تھا۔ پانی کی کراچی میں ابھی بھی کوئی قلّت شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن جب تک ہم نے یہ گھر ۱۹۶۴ء میں چھوڑا تو یہاں پانی کی قلّت شروع ہو چکی تھی۔ ہم نے یہاں امرود، سبزیاں، اور ہاں، ایک پپیتہ کا درخت لگایا جس کے پپیتے ہم سب کو آج تک یاد ہیں۔ بہت میٹھے، اور کچھ تو اندر سے سرخ نکلتے تھے۔ ہمارے بچے بھی بڑے ہونے لگے تھے۔ ہمارے تینوں بیٹے ناظم آباد ۷/نمبر کے بس اسٹاپ کے سامنے کراچی سیکنڈری اسکول میں پڑھتے تھے۔ یہ ایک اچھا اسکول تھا اور یہاں کی استانیاں ہماری ذاتی دوست بن گئیں تھیں۔ اس کی فیس مبلغ ساڑھے چھ روپے فی طالب علم تھی۔ بعد میں یہ اسکول مزید بڑھا، اور کالج بن گیا تھا۔

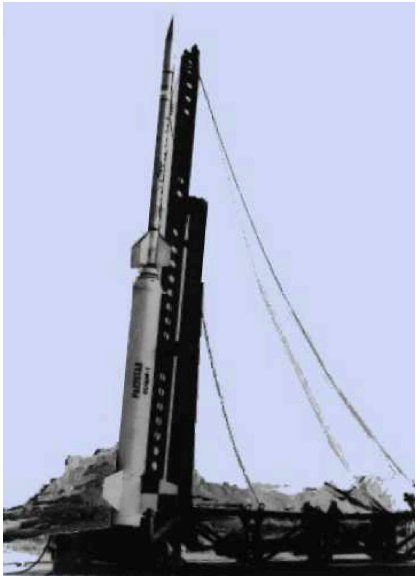

کراچی: رہبرِ اوّل (تصویر بشکریہ سپارکو)

۱۹۶۲ء میں بڑے صاحبزادے کیڈٹ کالج پٹارو میں داخل ہوگئے۔ یہ فوجی اسکول تھا لیکن ہمارے شوہر کے فوج سے سابقہ تعلق کے باوجود بھی فیسوں میں کوئی رعائیت نہیں تھی اور یہ فیس کراچی کے مہنگے ترین اسکول اور کالجوں کے مقابلہ کی تھی۔ اس وقت تک ہمارے چھ بچّے ہو چکے تھے اور ہمارے شوہر، اور ہم

سب کی یہ ہمّت تھی کہ ہم نے انہیں پٹارو بھیجا۔ اسی سلسلے میں ہم خود بھی کئی مرتبہ پٹارو گئے جو حیدرآباد کے نزدیک دریائے سندھ کے کنارے ایک دیہات تھا، اور شدید گرمی اور اتنی ہی شدید سردی کا علاقہ تھا۔ آس پاس کے دوسرے علاقے بھی دیکھے جن میں حیدرآباد، نواب شاہ اور ٹھٹّہ وغیرہ شامل تھے۔ یہ سارے سفر بہت ہی مختصر تھے۔ وقت اسی طرح اور گزرتا رہا، اور ہماری زندگی کچھ تھم سی گئی تھی۔ ہندوستان کے راستے بند تھے، لہٰذا مسجد کی یہ دوڑ رک گئی تھی، حتیٰ کہ ۱۹۶۴ء آ گیا۔ کراچی میں سرکلر ریلوے شروع ہوگئی اور ہمارے دو بچے جو عزیزآباد سے کراچی سیکنڈری اسکول جاتے تھے، اب اس ٹرین سے جانے لگے۔

ملک میں ویسے ہی ہنگاموں کی کیا کمی تھی، اب ایک ہنگامہ یہ کھڑا ہوا کہ جنرل ایوب خان کو اپنی حکومت کو قانونی درجہ دینے کی سوجھی۔ انہوں نے الیکشن کروائے، اور اس میں فاطمہ جناح اُن کے خلاف کھڑی ہوئیں۔ یہ اسلامی دنیا کے لئے بہت انوکھی چیز تھی۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی قیادت ایک عورت کے ہاتھ میں ہونا بالکل نئی چیز ہوتی۔ لیکن الیکشن نیشنل اسمبلی میں ہوئے جہاں کہا جاتا ہے کہ ممبروں کے ووٹ خریدے گئے اور نتیجتاً فاطمہ جناح ہار گئیں، گو کہ عوام کے ووٹوں کے حساب سے وہ جیت گئی تھیں۔ اب یہاں امریکہ میں صدر جارج بش ۲۰۰۲ء کی صدارت بالکل اسی طرح جیتے تو ہمیں فاطمہ جناح کا ہارنا یاد آ گیا۔

پاکستان میں سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں بھی بہت تیزی سے شروع ہو چلی تھیں۔ مردوں نے امریکی ٹیڈی بوائے فیشن کو اپناتے ہوئے ''ٹیڈی'' لباس پہننا شروع کر دیئے۔ اس لباس کی پہچان یہ تھی: تنگ موریوں کی پتلون، بند گلے والی بنیان نما قمیض یا ٹی شرٹ، اور سر پر بڑھے ہوئے بالوں کے ساتھ لمبی لمبی قلمیں۔ یہ لمبی قلمیں دیکھ کر شیونگ بلیڈ بنانے والوں کو ضرور پریشانی ہوئی ہوگی۔ وزیرانڈسٹریز نے نیا نیا ٹریٹ بلیڈ بنانے کا کارخانہ لگایا تھا، اور یہ لمبی قلمیں ان کے کاروبار کے لئے نقصان دہ ہوسکتی تھیں۔ پتلونوں کی موریاں اس قدر تنگ ہوتی تھیں کہ انہیں پہننا بھی مشکل اور اتارنا بھی۔ ہمارے تینوں بڑے صاحبزادے اسی طرح کے لباس سلوا کر لائے اور محلّے میں پہن کر اتراتے ہوئے پھرتے تھے۔ اسکولوں میں یونیفارم تھا اور وہاں اس کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے پڑوس میں کم از کم ایک لڑکی جو دس یا بارہ سال کی ہوگی، اپنے گھر میں ٹیپ ریکارڈر پر امریکی ٹوئسٹ کی موسیقی پر ناچ کر خوش ہو لیتی تھی۔ عورتوں نے بھی زمانے کا ساتھ دیا اور ان

کی شلواروں کے پائنچے بھی تنگ کر لئے گئے۔ ہم نے سوچا کہ خدا خدا کر کے رامپور اور لکھنؤ کے آڑے پاجامے سے نجات ملی تھی، اب یہ تنگ شلواریں کیسے برداشت ہوتی ہوں گی، لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ درزیوں نے پائنچوں کی تنگی سے کپڑے پہننے میں دشواری کا حل یہ نکالا کہ شلواروں اور پتلونوں کے پائنچوں میں چھپے ہوئے چٹ پٹ کے بٹن لگا لئے۔ جب چاہا، بٹن کھولے تو پائنچے بڑے ہو گئے۔ دوسری طرف پاکستان سے سارا سوت اور سوت کا کپڑا ملک سے باہر جانے لگا، اور پاکستان میں مکّھن زین کی جگہ ٹیٹرون اور ریعون کی پتلونیں اور قمیضیں پہنی جانے لگیں۔ ان کپڑوں کے رنگ اچھے ہوتے تھے، اور استری جلدی خراب نہیں ہوتی تھی، لہذا ان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف ان کو دھونا بھی آسان تھا، کہ دھوتے وقت پانی سے ان کا وزن اتنا بڑھتا نہیں تھا جتنا سوتی کپڑوں کا ہوتا تھا۔ ان کی بڑی خرابی صرف ایک تھی، اور وہ یہ کہ ان میں سے ہوا نہیں گزرتی تھی اور پسینہ کے بعد بہت پریشانی ہوتی تھی۔ لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اب پاکستان میں اپنے خوشبو والے صابن بننا شروع ہو گئے تھے جن میں لکس، روبی اور ریکسونا بہت مشہور تھے۔

جہاں زمانہ آگے جا رہا تھا، وہاں ہماری زندگی بھی آگے بڑھ رہی تھی۔ اب ہماری ساتویں اولاد آنے کو ہوئی، اور اتنے میں ہمارے شوہر کا تبادلہ لاہور شہر ہو گیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے شوہر ذاکر صاحب کو ایک کمپنی محمد امین محمد صدیق میں ملازمت ملی اور یہاں پیسے بھی زیادہ تھے۔ اس کمپنی نے لاہور میں اپنی ایک نئی شاخ کھولی تھی جس کا دفتر برانڈرتھ روڈ پر تھا۔ یہ ایک تجارتی مقام تھا اور یہاں کے تاجر باہر سے کافی سامان درآمد کرتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ان کو بہتر طور پر سہولتیں اور معلومات پہنچانے کے لئے ان کے اپنے دفتروں کے قریب ہی یہ دفتر بھی کھولا جاتا۔ کمپنی نے زیادہ تجربہ کار حضرات کراچی سے بھیجے، اور ان میں ایک ذاکر صاحب تھے۔ سو اس سلسلے میں ذاکر صاحب ہم سب کو کراچی میں چھوڑ کر خود لاہور چلے گئے۔ ہم امّید سے تھے۔ ہمارے دوسرے صاحبزادے شمس مڈل اسکول اسکالرشپ کے مقابلتی امتحان میں حصہ لے رہے تھے، اور بڑے صاحبزادے نجم کیڈٹ کالج پٹارو میں میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہم اس انتظار میں رہے کے بچّوں کے اسکول ختم ہو جائیں تو ہم بھی لاہور جائیں۔ ماں کی زندگی بھی کیسی بندھی ہوتی ہے۔

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے، اور ہماری ساتویں اولاد اور تیسری بیٹی روبی کی ولادت بھی ہو گئی۔ کہیں ۱۹۶۵ء میں ہمارا لاہور جانا ممکن ہو سکا۔